قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا اناسی واں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

مارچ 2022ء

''لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ'' (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

Pakistan
DAY
23RD MARCH

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

طلوعِ اسلام کا مقصد

جو احباب طلوع اسلام سے تعارف نہیں رکھتے ان کی آ گاہی کے لئے ہم طلوع اسلام کے مقصد کو وقتاً فوقتاً سامنے لاتے رہتے ہیں:

1- تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کر سکتی۔ اسے اپنی راہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

2- خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے ابد تک ضابطہ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آ سکتا ہے۔ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور حضور رسالتمآب ﷺ خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

3- قرآن کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

4- نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مقدسہ، شرف و عظمت انسانیت کی معراج کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت طیبہ کا جو حصہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضور ﷺ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضور ﷺ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہئے۔ یہی اصول صحابہ کبارؓ کی سیرت مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہئے۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے، ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

5- دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظام مملکت کی رو سے ہو سکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظام زندگی کا نام ہے) متمکن نہیں ہو سکتا۔

6- رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآن کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں، ان کی چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے امور مملکت امت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

7- رسول اللہ ﷺ کے بعد دین کا وہی نظام حضور ﷺ کے خلفائے راشدینؓ نے جاری رکھا۔ اس میں امور مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور

مارچ 2022ء
جلد 75 | شمارہ نمبر 03

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50روپے فی پرچہ
پاکستان: 600روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000روپے سالانہ

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: 23 مارچ	ادارہ	4
ایمان کی ضرورت کیوں؟	ادارہ	9
قرآنی پاکستان کیسا ہوتا؟	پرویز علیہ الرحمۃ	20
لطافت تمام شُد	امجد محمود، راولپنڈی	43
مشینی انسان اور قرآنی نظام	پرویزؒ	44
ریاستِ مدینہ کی ذمہ داریاں اور اس کی گراں قدر برکات	خواجہ ازہر عباس، کراچی	56

ENGLISH SECTION

The Human Self and Allah By G. A. Parwez (Translated by: Dr. Ejaz Rasool) Episode No. 4	60

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ2، لاہور54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions	For International Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672	IBAN:PK36NBPA0465004073177672 Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور　اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
چہ باید مرد را طبعِ بلندے، مشربِ نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

23 مارچ

یوں تو ہر دن اللہ ہی کا ہوتا ہے لیکن بعض دنوں میں اس قسم کے عظیم الشان انقلاب واقع ہوتے ہیں کہ قرآن انہیں ''ایام اللہ'' کہہ کر پکارتا ہے۔ اسی طرح قوموں کی زندگی میں بعض دن ایسے آتے ہیں جن میں ان کا کاروان حیات ایک نیا موڑ مڑتا ہے اور اس سے ان کی قسمت کا پانسہ پلٹ جاتا ہے۔ اس قسم کے دن قوموں کی زندگی میں یادگار بن جاتے ہیں اور تاریخ کے اوراق میں درخشندہ حروف میں لکھے جاتے ہیں۔ مسلمانان ہندو پاکستان کی حیات ملی میں کئی دن ایسے آئے ہیں جن کی یاد کو تاریخ اپنی آغوش میں محفوظ رکھے گی۔ ان میں سب سے پہلا یادگار دن 29 دسمبر 1930ء کا تھا جب الٰہ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں، حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے اپنا وہ خطبۂ صدارت ارزانی فرمایا جس نے فی الحقیقت اس قوم کے مستقبل کے دھارے کا رخ بدل دیا۔ اس سے پہلے مسلمانان ہند ایک راہ گم کردہ قافلے کی طرح پریشان و سرگرداں، ادھر ادھر مارے مارے پھرتے تھے۔ ان کے پاؤں اٹھتے تھے لیکن نہ سراغ راہ ان کے سامنے تھا نہ نشان منزل۔ وہ ہر دور سے نظر آنے والے غبار کی طرف لپک کر بڑھتے تھے کہ شاید اس میں وہ ''شہ سوارِ اشہبِ دوراں'' ہو جو انہیں صحیح و سلامت منزل مقصود تک لے جائے لیکن اس کے بعد مایوس ہو کر بیٹھ جاتے تھے کہ وہ غبار، بگولے کے رقص سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اس تشتت و انتشار اور یاس و حزن کے عالم میں اس حکیم الامت نے جسے قرآنی بصیرت نے دیدۂ انجم عطا فرمایا تھا، ان پراگندہ افرادِ کارواں کو پکارا اور نہایت حکمت و تدبر اور شفقت و محبت سے انہیں بتایا کہ ان کی منزل مقصود کیا ہے اور اس تک پہنچنے کا صحیح راستہ کونسا۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنے مخاطبین سے کہا کہ

مسلمانان ہندو پاکستان کی حیات ملی میں کئی دن ایسے آئے ہیں جن کی یاد کو تاریخ اپنی آغوش میں محفوظ رکھے گی۔ ان میں سب سے پہلا یادگار دن 29 دسمبر 1930ء کا تھا جب الٰہ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں، حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے اپنا وہ خطبۂ صدارت ارزانی فرمایا جس نے فی الحقیقت اس قوم کے مستقبل کے دھارے کا رخ بدل دیا

> آپ نے مسلم لیگ کے اس اجلاس کی صدارت کے لئے اس شخص کو منتخب کیا ہے جو اسلام کے مستقبل سے مایوس نہیں۔ اسے پورا پورا یقین ہے کہ اسلام میں وہ قوت موجود ہے جو انسان کو اس کی تنگ نظری سے نجات

دلا سکتی ہے جسے جغرافیائی حدود نے پیدا کر دیا ہے۔ جس کا ایمان یہ ہے کہ ایک فرد یا مملکت کی زندگی میں مذہب کی قوت بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ اور جو (اس حقیقت پر علیٰ وجہ البصیرت) یقین رکھتا ہے کہ اسلام اپنی تقدیر آپ ہے۔ اس لئے دنیا کا کوئی حادثہ اسے تباہ نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ یہ تمہاری غلط نگہی ہے جو تم نے سمجھ رکھا ہے کہ مسلمانوں کی قومیت وطن کی حدود سے متشکل ہوتی ہے۔ ان کی قومیت کا مدار اسلام پر ہے۔

جس نے جذبات اور وفا شعاریوں کے وہ بنیادی اصول عطا کئے ہیں جو رفتہ رفتہ پراگندہ افراد اور منتشر گروہوں میں یک جہتی اور یک نگہی پیدا کر کے انہیں آخرالامر ایک متعین قوم میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

> چند ہی سال کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس قوم نے 23 مارچ 1940ء کو اسی حکیم الامتؒ کے مرقد کے سرہانے کھڑے ہو کر اپنے اس عزم کا اعلان کیا کہ ہم ہندوستان میں اپنی جداگانہ مملکت کو قائم کر کے رہیں گے۔ یہ دن اس قوم کی کتاب زندگی میں ستاروں کی روشنائی میں لکھے جانے کے قابل ہے۔

قومیت کی ان نئی بنیادوں کی وضاحت کے بعد وہ مسلمانان ہند کے مستقبل کو سامنے لائے اور کہا کہ

میں چاہتا ہوں کہ پنجاب۔ صوبہ سرحد۔ سندھ اور بلوچستان کو ایک دوسرے میں مدغم کر کے ایک مملکت بنا لیا جائے۔

انہوں نے اپنی اس آواز کے اظہار تک ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ایمان و ایقان کی ایک ایسی آواز کے ساتھ جو دل کی گہرائیوں سے ابھرا کرتی ہے، پورے حتم و یقین سے فرمایا کہ

حکومت برطانیہ کے دائرہ کے اندر رہ کر ہو یا آزادانہ طور پر۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقہ میں مسلمانوں کی ایک مستحکم اور متحدہ مملکت کا قیام ان کے لئے مقدر ہو چکا ہے۔

یہ تھا نشان منزل (یعنی ہندوستان کے شمال مغربی علاقہ میں مسلمانوں کی ایک متحدہ مملکت کا قیام) اور وہ تھا سراغ راہ (یعنی وطنی، نسلی، لسانی نسبتوں سے بلند ہو کر، محض اسلام کی بنیادوں پر مسلم قومیت کی تشکیل) جو 29 دسمبر 1930ء کو اس پراگندہ فکر اور افسردہ خاطر قوم کے سامنے رکھا گیا۔ یہ دن، فی الحقیقت مسلمانان ہندوستان کی زندگی میں، ہمیشہ زندہ و تابندہ رہنے والا دن تھا۔

چونکہ ہر انقلابی آواز کی طرح یہ آواز بھی اپنے زمانے سے بہت آگے تھی اس لئے کسی نے اسے سنجیدگی سے درخور اعتنا نہ سمجھا۔ لیکن زمانے کے تقاضے قوم کو کشاں کشاں اسی طرف لئے جا رہے تھے۔ انہی تقاضوں نے ان میں قائداعظمؒ جیسی شخصیت کو ابھار دیا۔ انہوں نے سب سے پہلے، قومیت کے اس ''جدید'' تصور کے ماتحت، مسلمانان ہند کو ایک جداگانہ ملت کی حیثیت سے منظم کیا اور اس کے بعد ان میں اس منزل کے شعور کو بیدار کیا جس کا نشان اقبال نے 1930ء میں دیا تھا۔ چنانچہ

چند ہی سال کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس قوم نے 23 مارچ 1940ء کو اسی حکیم الامتؒ کے مرقد کے سرہانے کھڑے ہو کر اپنے اس عزم کا اعلان کیا کہ ہم ہندوستان میں اپنی جداگانہ مملکت کو قائم کر کے رہیں گے۔ یہ دن اس قوم کی کتاب زندگی میں ستاروں کی روشنائی میں لکھے جانے کے قابل ہے۔

اس عزم کے بعد، اس منزل تک پہنچنے کے لئے مسلسل جدوجہد جاری رہی تا آنکہ انہیں نہ صرف شمال مغربی بلکہ اس کے ساتھ ہی شمال مشرقی ہند میں بھی ایسا خطۂ زمین مل گیا جس میں یہ اپنے تصورات کے مطابق اپنی آزاد مملکت قائم کر سکتے تھے۔ یہ انقلاب عظیم 14 اگست 1947ء کو واقع ہوا۔ یہ دن ان کی حیات ملی میں ہزاروں مسرتوں اور لاکھوں شادمانیوں کا پیامبر تھا اور بلا شائبۂ تشکیک، قرطاسِ ارض پر سورج کی کرنوں سے مرصع کاری اور زرنگاری کا مستحق۔ اس طرح سترہ سال کے قلیل عرصہ میں (جو قوموں کی زندگی میں پلک جھپکنے سے زیادہ کا عرصہ نہیں کہلا سکتا) ایک ''شاعر کا خواب'' خواب یوسف کی طرح، حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آ گیا۔

اس طرح سترہ سال کے قلیل عرصہ میں (جو قوموں کی زندگی میں پلک جھپکنے سے زیادہ کا عرصہ نہیں کہلا سکتا) ایک ''شاعر کا خواب'' خواب یوسف کی طرح، حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آ گیا۔

لیکن جہاں ایک طرف، اس قوم کی قسمت کے ستارے یوں ایک ایک کر کے بیدار ہوتے جا رہے تھے، تاریکی کا ایک گوشہ بھی اس کے ساتھ چلا آ رہا تھا کہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور دیا لیکن قبل اس کے کہ یہ حقیقت منتظر، لباس مجاز میں سامنے آ جائے، وہ ہم سے رخصت ہو گیا۔ پھر جناحؒ نے وہ خطۂ ارض حاصل کر لیا جس میں اس جدید مملکت کو متشکل ہونا تھا لیکن قبل اس کے کہ اس کی بنیادیں اس نقشے کے مطابق استوار ہوں۔ وہ بھی ہمیں الوداع کہہ گیا۔ اب قوم کے برسر اقتدار طبقہ کی حالت ان رئیس زادوں کی سی ہو گئی جنہیں بیٹھے بٹھائے ایک ریاست ورثہ میں مل جائے۔ اور عوام کی حالت ان یتیموں کی سی جن کا کوئی والی وارث ہی نہ رہے۔ چنانچہ اس عرصہ میں، اوپر کے طبقے نے اس مفت میں ملی ہوئی ریاست کا جو کچھ حشر کیا اور نیچے کے طبقے کے ساتھ جو کچھ بیتی اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ:

فَلۡيَضۡحَكُوۡا قَلِيۡلًا وَّلۡيَبۡكُوۡا كَثِيۡرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ (9:82)

انہوں نے جو کچھ اپنے ہاتھوں سے کیا ہے، انہیں چاہئے کہ اسے دیکھ کر روئیں بہت زیادہ اور ہنسیں بہت کم۔

اقبال نے تخلیق پاکستان کی اہمیت یہ بتائی تھی کہ

> ہندوستان میں، بہ حیثیت ایک ثقافتی قوت کے، اسلام کی زندگی کا دارومدار اس پر ہے کہ اسے ایک خاص خطہ میں مرکوز کر دیا جائے۔

اس کے بعد انہوں نے کہا تھا کہ ''یہ خطۂ زمین بیرونی حملہ آوروں کی مدافعت کا ذریعہ بن جائے گا خواہ وہ حملے توپ و تفنگ کے ہوں اور خواہ نظریات و تصورات کے۔'' اس کے بعد انہوں نے کہا تھا کہ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ

اس سے اسلام کو اس کا موقع مل سکے گا کہ وہ اپنے آپ کو ان اثرات سے پاک اور صاف کر لے جنہوں نے اسے عربی ملوکیت کے زمانے میں ملوث کر دیا تھا۔ یہ اپنی تعلیم، اپنی ثقافت اور اپنے قوانین کو ایک طرف حقیقی اسلام سے اور دوسری طرف دورِ حاضرہ کے تقاضوں سے قریب تر کر سکے گا۔

یہ تھے وہ فوائد جو اسلام کو اس صورت میں حاصل ہونا تھے جب شمال مغربی خطہ ایک واحد مملکت بن جاتا۔ اب جبکہ ہم نے شمال مغربی خطہ کو ایک مملکت بنا لیا ہے، ہمارے پیشِ نظر ان مقاصد کا حصول ہونا چاہیئے۔ یعنی ہم اس خطۂ زمین میں ایسا معاشرہ قائم کریں جو حقیقی اسلام (یعنی قرآن) کے اصولوں پر متشکل ہو اور ان اصولوں کی روشنی میں ہم ایسے جزئی قوانین مرتب کریں جو دورِ حاضر کے تقاضوں کو کماحقہٗ پورا کر سکیں۔ اسی سے اسلام ان غیر اسلامی عناصر سے منزہ ہو سکے گا جو ہمارے دورِ ملوکیت کی یادگار ہیں اور جنہیں ہم غلط فہمی سے ہزار برس سے (حقیقی اسلام سمجھ کر) سینے سے لگائے پھر رہے ہیں اور اسی سے ہمارا دین ایک زندہ قوت بن کر دنیا میں ہماری حفاظت اور صیانت کا ذمہ دار بن جائے گا۔ اس لئے کہ (اقبال کے الفاظ میں) تاریخ کے نازک ادوار میں، اسلام نے مسلمانوں کو بچایا ہے۔ مسلمانوں نے اسلام کو نہیں بچایا۔''

لیڈر سے میری مراد ایسے افراد ہیں جو اپنی خداداد بصیرت یا تجربہ کی بنا پر، اسلام کی روح اور اس کی غایت سے پوری طرح واقف ہوں اور دوسری طرف عصرِ حاضر کے تقاضوں کا بھی صحیح صحیح احساس رکھتے ہوں۔ اس قسم کے افراد درحقیقت قوم کے لئے ''خدائی قوت'' کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ خدا کی طرف سے بنے بنائے ملتے ہیں۔ آرڈر دے کر بنوائے نہیں جا سکتے۔

اقبالؒ نے اپنے مذکورۂ بالا خطبہ میں یہ بھی بتایا تھا کہ ہمارے زوال کی دو علتیں بالکل نمایاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم میں صحیح ٹائپ کے لیڈر نہیں۔

> لیڈر سے میری مراد ایسے افراد ہیں جو اپنی خداداد بصیرت یا تجربہ کی بنا پر، اسلام کی روح اور اس کی غایت سے پوری طرح واقف ہوں اور دوسری طرف عصرِ حاضر کے تقاضوں کا بھی صحیح صحیح احساس رکھتے ہوں۔ اس قسم کے افراد درحقیقت قوم کے لئے ''خدائی قوت'' کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ خدا کی طرف سے بنے بنائے ملتے ہیں۔ آرڈر دے کر بنوائے نہیں جا سکتے۔

دوسری علت انہوں نے یہ بتائی تھی کہ ہماری قوم میں ''ملی شعور'' کی کمی ہوتی جا رہی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے ذاتی مفاد کے پیچھے پڑا رہتا ہے اور ملت کے تعمیری کاموں کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے ہاں اس وقت کوئی لیڈر بھی ان خصوصیات کا حامل نہیں جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے۔ جو لوگ فضا میں خلا کی وجہ سے مذہبی پیشوائیت کی مسندوں پر متمکن ہو گئے ہیں اور زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں انہیں نہ اس کا علم ہے کہ اسلام کی روح اور غایت کیا ہے اور نہ ہی اس کا شعور کہ عصرِ حاضر کے تقاضے کیا۔ لیکن اس کمی کو اس

طرح پورا کیا جاسکتا ہے کہ ہم باہمی مشاورت سے اپنے تمام معاملات میں قرآن سے راہنمائی حاصل کریں اور اس کی روشنی میں عصر حاضر کے پیش کردہ مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ ہوسکتا ہے کہ اس کوشش میں ہم کسی جگہ غلطی بھی کر جائیں۔لیکن غلطیوں سے کبھی گھبرانا نہیں چاہیے۔مزید تجربہ غلطیوں کی اصلاح خود بخود کردیا کرتا ہے۔ باقی رہی قوم میں ملی شعور کی بیداری، سواس کی واحد صورت وہی ہے جسے قرآن نے بطور اصل الاصول پیش کیا ہے۔یعنی انفرادی مفاد کو کم از کم کر کے ملی مفاد کو زیادہ سے زیادہ کر دیا جائے۔ بالفاظ دیگر، رزق کے سرچشموں کو انفرادی ملکیت سے نکال کر ملت کی اجتماعی تحویل میں دے دیا جائے تاکہ وہ انہیں تمام افرادِ ملت کی نشوونما کے کاموں میں صرف کر سکے۔قرآن نے اقوام کی تخلیق اور نشاۃ ثانیہ کا ایک اہم اصول بتایا ہے اور وہ یہ کہ پوری کی پوری قوم ایک فرد واحد کی حیثیت سے زندگی بسر کرے۔ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (31:28) اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ رزق کے سرچشموں میں افراد کا الگ الگ مفاد نہ رہے بلکہ پوری ملت کا مفاد مشترکہ ہو اور اس کے بعد کسی کے دل میں قطعاً یہ خیال نہ پیدا ہو کہ وہ سندھی ہے یا پنجابی۔ بلوچی ہے یا سرحدی۔ اگر اسلام لانے کے بعد بھی، امتیازاتِ رنگ بو کے یہ بت ہمارے دلوں میں قائم رہے تو سمجھ لیجئے کہ ہمارے دلوں میں ایمان نے گھر نہیں کیا۔ہم بدستور مشرک کے مشرک ہیں۔

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (76:3)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سانحہ ارتحال

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں

آہ محترم محمد لطیف چوہدری صاحب، بھی اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

مرحوم بحیثیت ناظم ادارہ طلوع اسلام اور مدیر ماہنامہ طلوع اسلام اپنے فرائض منصبی طویل عرصہ تک ادا کرتے رہے۔مرحوم ومغفور کی ادارہ طلوع اسلام اور تحریک طلوع اسلام کے لئے بے انتہا خدمات ہیں۔

بابا جی کے دروس القرآن کی زیادہ تر ویڈیو ریکارڈنگ بھی انہی کی ہاتھوں سے ہوا کرتی تھی۔

مرحوم ایک خوش مزاج اور ملنسار انسان تھے اور مشکل سوال کا جواب بھی مزاحیہ انداز میں خوبصورت طریقے سے دیا کرتے تھے۔تحریر وتقریر میں بھی ایک بلند اور منفرد مقام رکھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے سحاب کرم سے نوازیں اور پسماندگان ولواحقین کو صبر جمیل عنایت فرمائیں۔ادارہ طلوع اسلام اور بزمہائے طلوع اسلام لواحقین کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔(غمگسار خورشید انور، چیئرمین ادارہ)

ادارہ

ایمان کی ضرورت کیوں؟

اکثر پوچھا جاتا ہے کہ انسان کے لئے ایمان کی ضرورت کیوں ہے؟ سوال بڑا اہم ہے اور گہری فکر اور توجہ کا محتاج۔

ڈارون' اپنی عمر بھر کی تحقیق کے بعد' زندگی کے متعلق ایک نتیجہ پر پہنچا۔ جسے نظریۂ ارتقاء (Theory of Evolution) کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ کی تفصیل طول طویل ہے اور بعد کی تحقیقات نے اس کی بعض جزئیات کو غلط بھی ثابت کر دیا ہے۔ لیکن اس کا مرکزی تصور ابھی تک درست تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ مرکزی تصور وہ ہے جسے ہربرٹ اسپنسر نے بقائے اصلح (Survival of the fittest) کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ اس تصور کی رو سے یہ مانا جاتا ہے کہ کشمکش حیات میں وہی نوع باقی رہی جس نے اپنے اندر اس قدر قوت پیدا کر لی کہ ماحول کی تخریبی قوتیں اسے پامال نہ کر سکیں۔ اس تصور کے ماتحت' نظریہ یہ وضع اور تسلیم' کیا گیا کہ زندہ وہی رہ سکتا ہے جو سب سے زیادہ قوت حاصل کر لے' جو دوسروں کے مقابلہ میں کمزور ہو جائے' اسے زندہ رہنے کا حق نہیں رہتا۔ اس لئے زیادہ قوت رکھنے والے اسے ہڑپ کر سکتے ہیں۔ ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل لیتی ہے۔ چڑیا' کیڑوں مکوڑوں کو نوچ لیتی ہے اور عقاب' چڑیا کو دبوچ لیتا ہے۔ بلی' چوہے کو کھا جاتی ہے۔ کتا' بلی کو جھپٹ لیتا ہے۔ بھیڑیا' کتے کا گلا پکڑ لیتا ہے اور عندالضرورت' شیر' بھیڑیئے (اور جنگل کے ہر جانور) کا خون پی لیتا ہے۔ اسے ''جنگل کا قانون'' کہا جاتا ہے اور جنگل میں ایسا کرنے کو نہ معیوب سمجھا جاتا ہے' نہ مذموم۔ اس قانون کی رو سے اسے تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ کمزور کا وجود ہی اس لئے ہے کہ وہ طاقتور کو زندہ رکھنے کا ذریعہ بنے۔ کمزور اس وقت تک زندہ رہ سکتا ہے جب تک طاقتور کو اس کی ضرورت نہ پڑے۔ جس وقت طاقتور ضرورت محسوس کرے' وہ کمزور کو ہڑپ کر سکتا ہے۔ نظام فطرت میں یہی ہوتا چلا آیا ہے۔ یہی کچھ ہو رہا ہے' یہی ہوتا رہے گا۔ نہ بھیڑوں کی ہزار آرزوئیں شیر کو خوئے درندگی سے عاری کر سکتی ہیں' نہ بکریوں کے لاکھ ریزولیوشن بھیڑیوں کی تیزیٔ دنداں کو کند کر سکتے ہیں۔

کمزور اس وقت تک زندہ رہ سکتا ہے جب تک طاقتور کو اس کی ضرورت نہ پڑے۔ جس وقت طاقتور ضرورت محسوس کرے' وہ کمزور کو ہڑپ کر سکتا ہے۔ نظام فطرت میں یہی ہوتا چلا آیا ہے۔ یہی کچھ ہو رہا ہے' یہی ہوتا رہے گا۔ نہ بھیڑوں کی ہزار آرزوئیں شیر کو خوئے درندگی سے عاری کر سکتی ہیں' نہ بکریوں کے لاکھ ریزولیوشن بھیڑیوں کی تیزیٔ دنداں کو کند کر سکتے ہیں۔

نظامِ فطرت کے اسی مشاہدہ ومطالعہ کے بعد، یہ علمائے سائنس ''بقائے اصلح'' کے نظریہ تک پہنچے۔ اور اسے ایک مسلمہ کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اس نظریہ کی بنیاد اس نظامِ فطرت پر تھی جس کا تعلق حیوانی دنیا سے ہے۔ (یعنی اس دنیا سے جس میں زندگی انسانی سطح تک نہیں پہنچی) حیوانی دنیا میں فطرت کے طبعی قوانین (Physical Law) کارفرما ہیں ان قوانین میں دیکھا یہ جاتا ہے کہ ''ہو کیا رہا ہے'' (What is) ان میں ''کیا ہونا چاہئے''۔ (What ougth to be) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) یہ قوانین تھے حیوانی زندگی سے متعلق۔ لیکن نوعِ انسان کی بدقسمتی کہ یورپ نے یہ سمجھ لیا کہ یہی قوانین، خود انسانی زندگی پر بھی منطبق (Apply) ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے انسانی زندگی کو بھی سلسلہ ارتقاء (Chain of evolution) کی ایک کڑی قرار دیا، اس لئے یہ سمجھ لیا گیا کہ بنیادی طور پر انسان، دیگر حیوانات سے الگ نہیں۔ اس میں اور دیگر حیوانات میں اتنا ہی فرق ہے جتنا فرق حیوانات کی مختلف انواع (Species) میں ہے۔ جس طرح بنیادی طور پر وہ تمام انواع، حیوان ہی ہیں اور یکساں طور پر طبعی قوانین کے تابع، اسی طرح انسان بھی ایک حیوان ہے اس لئے فطرت کے جو قوانین، حیوانات پر لاگو ہوتے ہیں، انہی کے تابع انسان زندگی بسر کرتا ہے۔ اس منطق کی رو سے یورپ اس نتیجہ پر پہنچا کہ بقائے اصلح (Survival of the fittest) کا جو قانون حیوانی زندگی پر صادق آتا ہے، وہی قانون انسانی زندگی میں کارفرما ہونا چاہئے۔ یعنی یہ قانون کہ زندہ رہنے کا حق اسی کو ہے جو زیادہ سے زیادہ طبعی قوت فراہم کر لے۔ کمزور کو صرف اس وقت تک زندہ رہنے کی اجازت دی جاسکتی ہے جب تک طاقتور کو اس کی جان کی ضرورت نہ پڑے۔ جس وقت طاقت ور کی ضرورت یا مصلحت کا تقاضا ہو، وہ کمزور کو اپنا لقمہ بنا سکتا ہے۔ ایسا کرنا نہ معیوب ہے نہ مذموم۔ اس لئے کمزور کو اس کے خلاف آواز اٹھانے کا کوئی حق نہیں۔ اگر وہ آواز اٹھائے بھی تو اسے وہ چیخ سمجھنا چاہئے جو مرغی کے حلق سے اس وقت (بے اختیار) نکلتی ہے جب اسے بلی دبوچ لے جاتی ہے۔ اگر بلی، اس کی اس چیخ سے متاثر ہو کر اسے چھوڑ دیتی ہے، تو یہ اس کی حماقت ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بھوکوں مرے گی۔ اگر وہ مرغی کہیں مرافعہ (اپیل) بھی کرے تو بلیوں کی کوئی عدالت اس کے حق میں فیصلہ نہیں دے گی۔

وہ آواز اٹھائے بھی تو اسے وہ چیخ سمجھنا چاہئے جو مرغی کے حلق سے اس وقت (بے اختیار) نکلتی ہے جب اسے بلی دبوچ لے جاتی ہے۔ اگر بلی، اس کی اس چیخ سے متاثر ہو کر اسے چھوڑ دیتی ہے، تو یہ اس کی حماقت ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بھوکوں مرے گی۔ اگر وہ مرغی کہیں مرافعہ (اپیل) بھی کرے تو بلیوں کی کوئی عدالت اس کے حق میں فیصلہ نہیں دے گی۔

یورپ نے ''جنگل کے اس قانون'' کو، ایک مسلمہ حقیقت کے طور پر تسلیم کر کے، انسانی دنیا میں نافذ کر دیا۔ حیوانوں کی دنیا میں یہ صورت تھی کہ وہ مختلف انواع میں بٹے ہوئے تھے، جن میں ایک نوع دوسری نوع سے زیادہ طاقتور تھی۔ اور طاقتور

نوع' کمزور نوع کو کھاتی تھی۔ اس میں (بجز شاذ حالات کے) ایک نوع کے افراد' آپس میں ایک دوسرے کو کھانے نہیں لگ جاتے تھے۔ بلیاں چوہوں کو تو کھاتی تھیں' لیکن چوہے ایک دوسرے کو نہیں کھاتے تھے۔ انسان سب ایک نوع سے متعلق تھے' اس لئے ''جنگل کے قانون'' کے مطابق بھی ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا کہ اس ایک نوع کے افراد' ایک دوسرے کو کھانے لگ جاتے۔ اس دقت کو رفع کرنے کے لئے' یورپ نے' نوعِ انسانی کو مختلف اقوام میں تقسیم کر دیا اور ہر قوم کو ایک جداگانہ نوع تصور کر لیا گیا۔ اس کے بعد صورت یہ ہوگئی کہ جس قوم نے زیادہ قوت فراہم کر لی' اسے حق حاصل ہوگیا کہ وہ اپنے سے کمزور قوموں کو ہڑپ کر جائے۔ اس طرح ''جنگل کے قانون'' کا انسانی دنیا میں عام چلن ہوگیا۔ اس وقت یہی قانون ساری دنیا میں رائج ہے۔ (خود ایک قوم کے اندر بھی' مختلف طبقات نے کس طرح اس قانون کو اپنا رکھا ہے اور اسکی رو سے' صاحبِ قوت و اقتدار طبقہ' کمزوروں کو دبوچ لینا کس طرح اپنا حق سمجھتا ہے' ہم سر دست اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے اس وقت......ہم اپنے موضوع کو اقوام تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔)

> یہ ہے اس وقت دنیا کا نقشہ' اسے اگر ایک فقرہ میں سمٹانا چاہیں تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت جنگل کے قانون پر ساری دنیا کا ایمان ہے اس سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا' کہ ''ایمان'' کسے کہتے ہیں۔

بہرحال' یہ ہے اس وقت دنیا کا نقشہ' اسے اگر ایک فقرہ میں سمٹانا چاہیں تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ

اس وقت جنگل کے قانون پر ساری دنیا کا ایمان ہے اس سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا' کہ ''ایمان'' کسے کہتے ہیں۔

اس نظریۂ زندگی اور قانونِ حیات' کے خلاف ایک اور نظریۂ زندگی ہے۔ اس نظریۂ زندگی کے اصول یہ ہیں کہ:

(1) زندگی بے شک ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی پیکرِ انسان تک پہنچی ہے لیکن انسانی منزل میں پہنچ کر' اس میں ایک ایسی خصوصیت پیدا ہوگئی ہے جو اس کی سابقہ کڑیوں میں نہیں تھی۔ اسے آپ (محض سمجھنے کی غرض سے) ''انسانیت کی زندگی'' سے تعبیر کیجئے۔ (ویسے' اس خصوصیت کبریٰ کو انسانی ذات کہا جاتا ہے)

(2) انسان کی جسمانی زندگی تو حیوانات کی طرح طبعی قوانین کے تابع ہے لیکن اس کی ''انسانیت کی زندگی'' پر وہ قوانین منطبق نہیں ہوتے۔ اس کے لئے ایک اور ضابطۂ قوانین ہے۔ اسے مستقل اقدار (Permanent Values) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حیوانات میں اقدار (Values) کا تصور نہیں ہوتا۔ وہ صرف طبعی تقاضوں سے واقف ہوتے ہیں۔ اقدار کا تصور انسانی زندگی کی خصوصیت ہے۔

(3) حیوانی زندگی' طبعی قوانین کے تابع چلنے کے لئے مجبور ہوتی ہے۔ اس لئے اس میں ''کیا ہونا چاہئے'' (What ought to be) کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن انسانی زندگی میں اختیار و ارادہ ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی انسانی زندگی کو جس قسم کے قوانین کے تابع رکھنا چاہے رکھ سکتا ہے۔ یعنی یہ چاہے تو انسانی زندگی کو ''جنگل کے قانون'' کے تابع رکھ لے اور چاہے تو اسے مستقل اقدار کے تابع لے آئے۔

(4) ان مستقل اقدار کی رو سے، تمام انسان ایک نوع کے افراد ہیں اس لئے انہیں نہ اقوام میں تقسیم کرنے سے جدا گانہ انواع قرار دیا جا سکتا ہے، اور نہ ہی ایک قوم کے اندر، مختلف طبقات کی ناقابلِ عبور حدیں (Water-Tight compartments) کھڑی کی جاسکتی ہیں

(5) حیوانی زندگی میں، قانون حیات، بقائے اصلح ہے۔۔یعنی زندہ رہنے کا حق اسی کو ہے جو سب سے زیادہ طاقتور ہے لیکن مستقل اقدار کی رو سے قانون حیات ونظریہ بقا یہ ہے کہ۔

مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ (13:17)

باقی وہی رہ سکتا ہے جو نوع انسان کے لئے زیادہ سے زیادہ منفعت بخش ہو۔

یعنی اس میں قانون حیات ''بقائے انفع'' ہے۔۔جو فرد یا جماعت نوع انسانی کے لئے سب سے زیادہ نفع بخش کام کرے، اسے بقا نصیب ہوسکتی ہے۔

(6) مستقل اقدار کی رو سے، نوع انسان، ایک کارواں کی طرح مصروف سفر رہتا ہے۔اس کارواں میں اگر کوئی راہرو، کسی وجہ سے تھک کر پیچھے رہ جائے، تو دیگر افراد کارواں کا فریضہ ہوتا ہے کہ وہ اس کے لئے سواری کا انتظام کریں تاکہ وہ درماندہ راہرو، دیگر افراد کارواں کے دوش بدوش، سفر کرنے کے قابل ہو جائے۔اگر کوئی درندہ اس درماندہ راہرو کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس پر حملہ کرے، تو پورے کا پورا کارواں اس کی مدافعت وحفاظت کے لئے سینہ سپر ہوجاتا ہے۔

اس میں افراد کارواں کی صلاحیتوں کے اعتبار سے ان کے ذمے مختلف فرائض عائد کردیئے جاتے ہیں۔لیکن اس تقسیم کار سے، ایک کو دوسرے پر غلبہ وتسلط کا حق حاصل نہیں ہوجاتا۔یہ تقسیم عمل، کارواں کے حسن نظم کے لئے ہوتی ہے۔اور بس

> جس قدر کوئی انسان، دوسروں کے لئے نفع بخشیوں کا سامان بہم پہنچائے، اس سے اسی قدر اس کی انسانی زندگی سنور جاتی اور اس قابل ہوجاتی ہے کہ وہ اپنی طبعی زندگی کے بعد، زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرسکے۔اپنے مستقبل کو سنوارنے کا خیال وہ جذبۂ محرکہ ہے جس سے انسان، دوسروں کی خاطر زیادہ سے زیادہ محنت کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔ جسے بظاہر ''دوسروں کی خاطر'' کچھ کرنا سمجھا جاتا ہے، وہ درحقیقت خود اپنے لئے ہوتا ہے۔

(7) (جیسا کہ کہا جاچکا ہے) مستقل اقدار کی رو سے، قوت، صرف کمزوروں کی حفاظت کے لئے استعمال کی جاتی ہے، کسی کو کمزور کرنے اور پھر اس کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھانے (Exploitation) کے لئے استعمال نہیں کی جاتی۔

(8) اس نظریہ زندگی کی رو سے، مقصد حیات یہ ہے کہ انسان فطرت کی قوتوں کو مسخر کرکے...... پوری انسانیت کی زندگی کو بلند سے بلند تر کرتا جائے۔جس طرح پانی اپنی سطح ہموار رکھتا ہے اس میں کہیں نشیب وفراز اور ناہمواریاں نہیں ہوتیں، اسی طرح جب انسانیت کی زندگی کا معیار بلند ہوتا ہے تو اس میں پوری انسانیت کی سطح ہموار ہوتی ہے۔

(9) سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ جذبۂ محرکہ کیا ہے جس سے انسان، زیادہ سے زیادہ محنت کر کے، دوسروں کی کمی کو پورا کر کے انہیں اپنی سطح پر لانے کی کوشش کرے۔

مستقل اقدار کی رو سے، اصول یہ ہے کہ جس قدر کوئی انسان، دوسروں کے لئے نفع بخشیوں کا سامان بہم پہنچائے، اس سے اسی قدر اس کی انسانی زندگی سنور جاتی اور اس قابل ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی طبعی زندگی کے بعد زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کر سکے۔ اپنے مستقبل کو سنوارنے کا خیال وہ جذبۂ محرکہ ہے جس سے انسان، دوسروں کی خاطر زیادہ سے زیادہ محنت کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔ جسے بظاہر ''دوسروں کی خاطر'' کچھ کرنا سمجھا جاتا ہے، وہ درحقیقت خود اپنے لئے ہوتا ہے۔

قرآن، جنگل کے قانون والے نظریہ زندگی کو کفر سے تعبیر کرتا ہے اور اپنے پیش کردہ نظریہ کو اسلام کہہ کر پکارتا ہے۔ اس نے کفر اور حیوانی سطح زندگی کو مرادف قرار دیا ہے۔ سورۂ محمدؐ میں ہے۔
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (47:12)

یہ ہے دوسرا نظریۂ زندگی یا قانونِ حیات جسے قرآن کریم پیش کرتا ہے۔ اس نظریہ کو مسلمہ حقیقت سمجھنا، ایمان کہلاتا ہے۔

قرآن، جنگل کے قانون والے نظریہ زندگی کو کفر سے تعبیر کرتا ہے اور اپنے پیش کردہ نظریہ کو اسلام کہہ کر پکارتا ہے۔ اس نے کفر اور حیوانی سطح زندگی کو مرادف قرار دیا ہے۔ سورۂ محمدؐ میں ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (47:12)

جو لوگ کفر کرتے ہیں وہ حیوانات کی طرح کھاتے پیتے اور سامانِ زندگی سے متمتع ہوتے ہیں۔

چونکہ قرآن کریم اس نظریۂ زندگی کو غلط قرار دیتا ہے اس لئے اسے صحیح ماننے والوں کے متعلق وہ کہتا ہے کہ ''وہ باطل پر ایمان'' رکھتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (29:52)

جو لوگ اس باطل نظریۂ حیات پر ایمان رکھتے ہیں اور خدا کے عطا کردہ صحیح نظریہ زندگی سے انکار کرتے ہیں، وہ آخرالامر سخت نقصان اٹھائیں گے۔

یوں تو ایمان بالباطل شروع ہی سے انسان کے ساتھ چلا آ رہا ہے، لیکن پہلے اس کی حیثیت انفرادی سی ہوتی تھی، مغرب نے، طبعی کائنات میں کارفرما جنگل کے قانون کو انسانی زندگی پر منطبق کر کے، اسے عالمگیر پوزیشن دے دی۔ جسے تہذیب مغرب کہا جاتا ہے، وہ اسی ایمان بالباطل۔۔ یعنی جنگل کے قانون کو نظریۂ حیات سمجھنے کا دوسرا نام ہے۔ مغرب نے اسے سائنس کا ایک عظیم انکشاف قرار دے کر بطور فلسفۂ حیات اختیار کیا۔ اسی کو مادی نظریۂ حیات یا (Materialistic concept of life) کہا جاتا ہے۔۔ اور چونکہ بدقسمتی سے اقوام مغرب دنیا میں اقوام غالب کی حیثیت سے پھیل گئیں اس لئے ان کا یہ فلسفۂ زندگی یا ایمان بالباطل تمام اقوام عالم میں پھیل گیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اب یہ قانون ساری دنیا کا عام چلن ہو گیا

ہے۔ یوں تو اقوام یورپ نے اس قانون کو نظریہ ارتقا ہی کی روشنی میں اپنایا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ عیسائیت اور یہودیت کے غلط عقائد نے جو فضا پیدا کر دی تھی ۔ وہ اس نظریہ کے لئے بڑی سازگار تھی ۔ عیسائیوں کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ نجات کا مدار انسانی اعمال پر نہیں بلکہ حضرت مسیحؑ کے کفارہ کے ایمان پر ہی، یہودیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ جنت، بنی اسرائیل کی نسل کے لئے مخصوص ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ان عقائد کی رو سے، انسانی اعمال کی اہمیت بالکل ختم ہو جاتی ہے اور یہودیوں کے گھر میں پیدا ہو جانے، یا حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لے آنے کے بعد، انسان کو کھلی چھٹی مل جاتی ہے کہ وہ جس قسم کے چاہے کام کرے، اس سے کوئی باز پرس ہی نہیں ہوگی۔ انہی عقائد کا فطری نتیجہ یہ تھا کہ عیسائیوں نے مذہب کو سیاست سے الگ کر دیا۔ (اس زمانے میں یہودیوں کی سلطنت کہیں نہیں تھی، اس لئے یہ ثنویت عملاً عیسائی مملکتوں میں رائج ہوئی)۔ اس سے اقوام مغرب میں انسانی تمدن کا نقشہ یوں مرتب ہوا کہ حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان ایک پرائیویٹ عقیدہ کی حیثیت لئے ہوئے، اور امور سیاست میں کھلی چھٹی کہ جس طرح جی چاہے کریں۔۔۔ عیسائیت نے یورپ میں یہ فضا پیدا کر دی۔ اس پر نظریۂ ارتقاء نے ''جنگل کے قانون'' کو بطور نظام فطرت پیش کر دیا۔ لہٰذا یہی قانون وہاں کی زندگی کا عام چلن ہو گیا۔

اس ''ایمان بالباطل'' نے دنیا کو کس طرح جہنم بنا رکھا ہے، اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ ہم سب اس جہنم کے اندر ہیں اس لئے اس کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کر رہے ہیں۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ ساری دنیا ایک وسیع و عریض جنگل بن چکی ہے۔ جس میں بعض قوموں نے (کسی نہ کسی طرح قوت فراہم کر کے) شیروں کی شکل اختیار کر رکھی ہے۔ ان سے دوسرے درجے پر بعض قومیں بھیڑیوں کی سطح پر ہیں اور باقی تمام اقوام عالم، بھیڑوں اور بکریوں کی طرح ان کے رحم و کرم پر زندگی کے دن پورے کر رہی ہیں

اس ''ایمان بالباطل'' نے دنیا کو کس طرح جہنم بنا رکھا ہے، اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ ہم سب اس جہنم کے اندر ہیں اس لئے اس کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کر رہے ہیں۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ ساری دنیا ایک وسیع و عریض جنگل بن چکی ہے۔ جس میں بعض قوموں نے (کسی نہ کسی طرح قوت فراہم کر کے) شیروں کی شکل اختیار کر رکھی ہے۔ ان سے دوسرے درجے پر بعض قومیں بھیڑیوں کی سطح پر ہیں اور باقی تمام اقوام عالم، بھیڑوں اور بکریوں کی طرح ان کے رحم و کرم پر زندگی کے دن پورے کر رہی ہیں۔ ان شیروں اور بھیڑیوں کا جب جی چاہے کسی بھیڑ یا بکری کو دبوچ لیتے ہیں۔ وہ بے چاری ممیاتی ہوئی دم توڑ دیتی ہے اور باقی ڈری اور سہمی ہوئی جھاڑیوں میں دبک کر بیٹھ جاتی اور اپنی باری کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ ''جنگل کے ان بادشاہوں'' سے کوئی پوچھنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو۔ تاریخ کے اوراق، طاقتور قوموں کی طرف سے اس قسم کی ہمہ گیر سبعیت و بربریت اور دوسری طرف کمزور قوموں کی اس حد تک بے بسی اور بے کسی کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ سڑک پر دو آدمی آپس میں لڑ پڑیں تو راہ گذر انہیں چھڑا دیتے ہیں اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو پولیس کا سپاہی انہیں گرفتار کر لیتا، اور عدالت، زیادتی کرنے والے کو سزا دے دیتی ہے۔ لیکن یہاں کیفیت یہ ہے کہ

ایک درندہ صفت ملک' لاکھوں بے گناہ انسانوں کو ذبح کئے جا رہا ہے اور کسی میں ہمت نہیں پڑتی کہ مظلوم کی فریاد کو پہنچے۔ ادھر اسی امریکہ کو اور برطانیہ کو عربوں کا گلا دبانے کی ضرورت پڑی تو فلسطین کی لاکھوں پر امن آبادی کو دھکیل کر باہر کر دیا اور وہاں جدید اسرائیلی حکومت قائم کر دی۔ اس کے بعد اس نومولود کو اس قدر طاقتور بنا دیا گیا کہ وہ اب اس ''جنگل کا بادشاہ'' بن رہا ہے۔ اس کے خلاف نہ صرف یہ کہ کسی کو انگلی نہیں اٹھانے دی جاتی بلکہ نام نہاد فریادگاہ (یو۔این۔او) میں زبانیں گنگ کر دی جاتی ہیں کہ کوئی اس خنجر بدست لاڈلے کے خلاف لب کشائی تک بھی نہ کر سکے۔ اگر وہاں کوئی ریزولیوشن پاس بھی ہو جاتا ہے تو یہ اس کاغذ کے پرزے کو مسل کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتا ہے اور وہ سب قومیں جنہوں نے یہ ریزولیوشن پاس کیا تھا اس کا منہ تکتی رہ جاتی ہیں۔ یہ ہے اس ''جنگل کے قانون'' پر ایمان کا نتیجہ! ان اقوام نے اپنی کہنہ روایات میں ہمدردی بنی نوع انسان جیسے جو الفاظ سن رکھے تھے' ان کا مظاہرہ اس طرح ہوتا ہے کہ جب بھیڑیا' بھیڑوں کے گلے پر حملہ کر رہا ہوتا ہے تو ریڈ کراس کا ایمبولینس دور کھڑا محو تماشا ہوتا ہے۔ جب وہ ایک بھیڑ کو اٹھا کر لے جاتا ہے تو یہ ایمبولینس' ہمدردیٔ نوع انسان کے جذبے سے سرشار' آگے بڑھتا ہے تاکہ جو زخمی بھیڑیں زمیں پر تڑپ اور سسک رہی ہیں' ان کے حلق میں پانی ٹپکائے۔ یہ ایمبولینس انہیں بھیڑیوں کا مہیا کردہ ہوتا ہے جو ان بھیڑوں کے خون پر پلتے ہیں' دنیا ان کے اس جذبۂ ہمدردی کو سراہتی اور ان کی شان میں مدح و ستائش کے قصیدے پڑھتی ہے۔ قرآن کریم نے یہودیوں کے جرائم کی جو فہرست پیش کی ہے' اس میں ان کے ایک جرم کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تم وہ لوگ ہو کہ خود اپنے بھائی بندوں کو قتل کرتے ہو اور ان میں سے بعض کو ان کے گھر بار سے نکال باہر کرتے ہو۔ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ؕ تم میں سے ایک گروہ یہ کچھ کرتا ہے اور دوسرے لوگ اس ظالم اور مستبد گروہ کی پیٹھ ٹھونکتے ہیں وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ جب ان مظلوموں کو جنہیں تم نے ان کے گھروں سے نکال باہر کیا تھا' دوسرے لوگ قیدی بنا کر لے جاتے ہیں' تو تم چندے اکٹھے کرتے ہو تاکہ ان قیدیوں کا فدیہ ادا کر کے انہیں قید سے آزاد کرایا جائے۔ اس طرح تم اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہو کہ ہم بڑا ثواب کا کام کر رہے ہیں وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ (2:85)۔ حالانکہ تم نے جو انہیں ان کے گھروں سے نکال باہر کیا تھا' تو وہ تمہارے لئے کیسے جائز تھا!

نام نہاد فریادگاہ (یو۔این۔او) میں زبانیں گنگ کر دی جاتی ہیں کہ کوئی اس خنجر بدست لاڈلے کے خلاف لب کشائی تک بھی نہ کر سکے۔ اگر وہاں کوئی ریزولیوشن پاس بھی ہو جاتا ہے تو یہ اس کاغذ کے پرزے کو مسل کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتا ہے اور وہ سب قومیں جنہوں نے یہ ریزولیوشن پاس کیا تھا اس کا منہ تکتی رہ جاتی ہیں

بعینہٖ اسی قسم کے ''ثواب کے کام'' موجودہ دور کے قزاق اور رہزن کرتے ہیں۔ پہلے لاکھوں فلسطینی عربوں کو' ان کے گھر بار سے نکال کر ویرانوں میں دھکیل دیا اور اس کے بعد ان ''پناہ گزینوں'' کی امداد کے لئے خیراتی فنڈ کھول کر دنیا سے

داد لی جاتی ہے کہ دیکھو! ہمارا سینہ مظلوموں اور غریبوں کے درد سے کس قدر لبریز ہے۔

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو! یہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا

لیکن ''جنگل کے قانون'' کے اس قسم کے مظاہرے دیگر اقوام کے ہاں جا کر ہی نہیں ہوتے' ان بالا دست اقوام کے خود اپنے گھر بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ جب ایمان یہ ٹھہرا کہ انسان ایک حیوان ہے اور ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' قانون حیات۔ تو پھر دلوں میں کسی ایسے آئین اور ضابطہ کا احترام کیسے پیدا ہوسکتا ہے جو افراد معاشرہ کے حیوانی جذبات کی بے محابا تسکین کی راہ میں حائل ہو۔ اس کا نتیجہ ہے کہ خود اقوام مغرب میں جرائم کی تعداد اس قدر ہوشربا تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ یہ اتنی بڑی بڑی قوتوں کی حامل قومیں' اس سیلاب بے پناہ کی روک تھام سے عاجز آ چکی ہیں۔ ہمارے ایک بالغ نظر دوست حال ہی میں امریکہ گئے ہیں۔ وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''جنگل کے قانون'' کے اس قسم کے مظاہرے دیگر اقوام کے ہاں جا کر ہی نہیں ہوتے' ان بالا دست اقوام کے خود اپنے گھر بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ جب ایمان یہ ٹھہرا کہ انسان ایک حیوان ہے اور ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' قانون حیات۔ تو پھر دلوں میں کسی ایسے آئین اور ضابطہ کا احترام کیسے پیدا ہوسکتا ہے جو افراد معاشرہ کے حیوانی جذبات کی بے محابا تسکین کی راہ میں حائل ہو۔

یہاں قوم کی حالت عجیب ہے۔ سب لوگ عجب انتشار کا شکار ہیں۔ جرائم کی رفتار سن کر آپ دنگ رہ جائیں گے۔۔ یعنی تیس لاکھ۔۔ ہر گھنٹہ کے بعد قتل۔ اکیس منٹ کے بعد ڈکیتی۔ چار منٹ کے بعد زنا بالجبر۔ ہر دس سیکنڈ کے بعد نقب زنی۔ اور ہر سیکنڈ کے بعد چوری۔ اس سال چالیس ہزار افراد حادثات کا شکار ہوئے۔۔۔ اور کیا لکھوں؟

یہ امریکہ کی حالت ہے۔ برطانیہ میں جنسی بدنہادی اب اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ وہاں لواطت کو قانوناً جائز قرار دیا گیا ہے۔ (حالانکہ وہاں عورتوں کی تعداد اب بھی مردوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے) اور اس کے لئے وجۂ جواز یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ وبا اتنی عام ہو چکی ہے کہ اس کی روک تھام حکومت کے بس کی بات نہیں رہی۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ اسے قانوناً جائز قرار دے کر' اس فعل شنیع کے مرتکبین کو کم از کم اس نفسیاتی الجھن سے بچا لیا جائے جو اس کے قانوناً ناجائز ہونے کی وجہ سے ان کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔

یہ ہیں حیوانی سطح زندگی پر ایمان کے نتائج وعواقب' اجتماعی اور انفرادی زندگی میں۔ انفرادی زندگی کی یہ مثالیں ہم نے ضمناً پیش کر دی ہیں۔ اس وقت ہمارے پیش نظر بالخصوص' اس ایمان کے وہ عواقب ہیں جو انسانوں کی بین الاقوامی زندگی کو محیط ہو رہے ہیں۔ یعنی ہر جگہ جنگل کا قانون کارفرما ہے اور حالت اب یہ ہو چکی ہے کہ ؎

اس سیل سبک سیر وزمیں گیر کے آگے عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

اقبال ہی کے دوسرے الفاظ میں ؎

تہذیب کا کمال، شرافت کا ہے زوال　　غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش
ہر گرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش

☆☆☆

''جنگل کے قانون'' پر ایمان کے نتائج وعواقب ہمارے سامنے آ چکے ہیں۔اس کے برعکس ''مستقل اقدار'' پر ایمان کیا نتائج مرتب کرتا ہے' ہمیں افسوس ہے کہ عصر حاضر سے ہم اس کی عملی مثالیں پیش کرنے سے قاصر ہیں۔۔اس لئے کہ اس وقت دنیا میں کوئی خطۂ زمین بھی ایسا نہیں جس میں ان اقدار پر عمل ہو رہا ہو۔۔اقوام مغرب کا تو ان اقدار پر ایمان ہی نہیں' لیکن جو قوم (یعنی مسلمان) ان پر ایمان رکھنے کی مدعی ہے' اس کا بھی درحقیقت ان پر ایمان نہیں۔۔ ایمان کی پرکھ اعمال سے ہوتی ہے۔

وقت آنست کہ آئینِ دِگر تازہ کُنیم
لوحِ دل پاک بشوئیم و زسر تازہ کُنیم
''آئین دگر'' سے اس کی مراد یہ تھی کہ ''جنگل کے قانون'' کی جگہ مستقل اقدار انسانیت کو آئینِ حیات قرار دیا جائے۔

ایمان' انسان کے دلی فیصلہ کا نام ہے۔جس کی نمود اس کے مطابق عمل (کام کرنے) سے ہوتی ہے۔۔لیکن یہ اقدار کیا نتائج مرتب کرسکتی ہیں' اس کا اندازہ ان اقدار پر غور وتدبر سے لگایا جا سکتا ہے۔کسی قوم کا اس حقیقت پر ایمان کہ میری قوت کمزوروں کی حفاظت کے لئے ہے' کس قسم کے نتائج پیدا کرسکتا ہے' اسے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کے دماغ کی ضرورت نہیں۔اس وقت جنگل کے قانون پر ایمان نے دنیا میں کیفیت یہ پیدا کر رکھی ہے کہ کمزور قومیں تو ڈری اور سہمی ہوئی ہیں ہی' خود طاقتور قومیں بھی ایک دوسرے کی طرف سے بے خطر اور مامون نہیں۔کہتے ہیں کہ جب برف عام پڑ جائے تو بھیڑیئے کسی غار میں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔کھانے کو کہیں سے کچھ ملتا نہیں تو وہ بیٹھے ایک دوسرے کو تاکتے رہتے ہیں جونہی کسی کو اونگھ آئی' باقی بھیڑیوں نے اسے دبوچ لیا۔اس وقت دنیا کی طاقتور اقوام کی بعینہٖ یہی حالت ہو چکی ہے۔ہر قوم کو دوسری قوم کی طرف سے خطرہ ہے اس لئے کسی کو کسی پر اعتماد نہیں۔چونکہ ان سب کا ایمان جنگل کے قانون پر ہے' اس لئے ہر قوم اسی میں اپنی عافیت سمجھتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ قوت فراہم کرے۔اس لئے یہ اقوام' حصول قوت کی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی فکر اور کوشش میں پاگل ہو رہی ہیں۔لیکن اس دوڑ میں اب ہر قوم تھک چکی ہے۔یہ وجہ ہے کہ یہ قومیں تیسری عالمگیر جنگ کے تصور سے گھبراتی ہیں۔ورنہ جس قسم کے واقعات پہلی اور دوسری عالمگیر جنگوں کے لئے بہانہ بن گئے تھے' ان سے کہیں زیادہ شدید واقعات اب آئے دن ظہور میں آتے رہتے ہیں لیکن عالمگیر جنگ نہیں چھڑتی۔

اقبالؒ نے پہلی جنگ عظیم کے بعد' اقوام مغرب سے کہا تھا کہ ؎

وقت آنست کہ آئینِ دِگر تازہ کُنیم　　لوحِ دل پاک بشوئیم و زسر تازہ کُنیم

''آئین دگر'' سے اس کی مراد یہ تھی کہ ''جنگل کے قانون'' کی جگہ مستقل اقدار انسانیت کو آئینِ حیات قرار دیا جائے۔

اس وقت اس کی کسی نے نہ سنی اور اقوامِ مغرب اپنی وحشت سامانیوں میں آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئیں۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اب وقت زیادہ مساعد ہے۔۔ کمزور قومیں بہت زیادہ سہمی ہوئی ہیں اور طاقتور قومیں' باہمی عدمِ اعتماد کے ہاتھوں تنگ آ چکی ہیں۔۔ اگر اس وقت دنیا کی کوئی قوم بھی اپنے نظام کو مستقل اقدار پر متشکل کرلے' تو مردم گزیدہ انسان اس کی طرف لپک کر آئے گا۔ اقبال کو کسی ایسی ہی قوم کی تلاش تھی جسے وہ اس طرح دیوانہ وار پکار پکار کر آوازیں دے رہا تھا کہ

اے بندۂ مومن! تو کجائی؟ تو کجائی؟

جب وہ بندۂ مومن کو یوں پکار پکار کر تھک گیا تو پاکستان کا تصور اس کے افقِ قلب سے ابھرا۔ اس نے 1923ء میں لکھا تھا کہ:

> اقوامِ عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم محض اس لئے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں۔ ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ یورپ کی جنگِ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا اور اب تہذیب وتمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے۔ (دیباچہ پیامِ مشرق)

''جنگل کے قانون'' کے مطابق' ہم ان قوموں کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتے جو طبعی قوت میں ہم سے کہیں آگے نکل چکی ہیں۔ لہٰذا' ہمارے لئے چارۂ کار یہ تھا کہ ہم اپنے ہاں' اس بربریت کے قانون کی جگہ' انسانیت ساز اقدار کو فروغ دیتے اور پھر دیکھتے کہ دنیا کی کوئی قوت بھی' ان کا مقابلہ کرسکتی ہے؟

اس نے پاکستان کی ''نئی دنیا'' کا تصور' اسی ''نئے آدم'' کی نمود کے لئے دیا تھا لیکن افسوس کہ ہم بھی اقوامِ مغرب کی نقالی میں' انہی فرسودہ راہوں پر چل نکلے اور اتنا نہ سمجھا کہ ''جنگل کے قانون'' کے مطابق' ہم ان قوموں کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتے جو طبعی قوت میں ہم سے کہیں آگے نکل چکی ہیں۔ لہٰذا' ہمارے لئے چارۂ کار یہ تھا کہ ہم اپنے ہاں' اس بربریت کے قانون کی جگہ' انسانیت ساز اقدار کو فروغ دیتے اور پھر دیکھتے کہ دنیا کی کوئی قوت بھی' ان کا مقابلہ کرسکتی ہے؟ قرآن نے جب کہا تھا کہ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (9:33) مستقل اقدار پر مبنی نظامِ حیات' دنیا کے تمام دیگر نظامہائے زندگی پر غالب آ سکتا ہے تو اس نے یونہی شاعری نہیں کی تھی۔ جب اس نے اعلان کیا تھا کہ وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (3:139) اگر تم جنگل کے قانون پر ایمان کی جگہ' انسانی اقدار کی صداقت پر ایمان لے آئے' تو تم ساری دنیا پر غالب آ جاؤ گے' تو اس نے (معاذ اللہ) دروغِ مصلحت آمیز سے کام نہیں لیا تھا۔ جب اس نے کہا تھا کہ وَلَن يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا (4:141) غلط نظریہ زندگی پر ایمان رکھنے والے' ان لوگوں پر کبھی غالب نہیں آ سکتے جو صحیح قانونِ حیات پر ایمان رکھیں' تو اس نے (معاذ اللہ) اس قوم کو جھوٹی ''ہلاشیری'' نہیں دی تھی۔ اس نے اس حقیقت کو بیان کیا تھا کہ حیوان کتنی ہی عظیم قوت کا مالک کیوں نہ ہو جائے' ''انسانی قوت'' کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور ظاہر ہے کہ دنیائے تہذیب وتمدن میں'

''انسانی قوت'' سے مراد ان اقدار کی قوت ہے جن سے انسانیت تشکیل پذیر ہوتی ہے۔ ہم نے اس قوت کو کبھی آزمایا نہیں اس لئے ہم اس کی عظمت و اہمیت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔۔ اور آزمایا اس لئے نہیں کہ ہمیں اس پر ایمان نہیں۔۔ ایمان تو ایک طرف رہا، جنگل کے قانون کی وجہ سے، ہمارے ہاں بھی عظمت و اہمیت کے معیار اس قدر بدل چکے ہیں کہ ہم شاید ''احترام آدمیت'' کا مفہوم تک سمجھنے کے بھی قابل نہیں رہے۔ لیکن اس کے باوجود، ہم سمجھتے ہیں کہ اس وقت دنیا میں کوئی خطۂ زمین ان اقدار کی تجربہ گاہ بننے کے قابل ہوسکتا ہے تو وہ پاکستان ہی ہے۔۔ ہماری فضاؤں میں سرسید، اقبال، جناح کے تصورات ابھی تک جگمگا رہے ہیں۔ یہاں جس انداز سے قرآنی فکر عام ہو رہا ہے دنیا میں کسی اور جگہ اس کی مثال نہیں ملتی اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہم نے اس مملکت کو حاصل ہی اس مقصد کے لئے کیا تھا۔

لیکن اگر ان تمام دلائل و براہین کے باوجود (بدنصیبی سے) ہمیں اس حقیقت پر یقین نہیں آ سکتا، کہ ان اقدار پر عمل کرنے سے ہمیں سرفرازی و سربلندی نصیب ہوسکتی ہے، تو بر سبیل تنزل، اسے آزمائشاً اختیار کر کے ہی دیکھ لیا جائے۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، یہ حقیقت ہے کہ جنگل کے قانون کے مطابق، ہم طبعی قوت میں اقوام غالب کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہم ایک متبادل طریق علاج کے طور پر، ان اقدار پر عمل کر کے دیکھ لیں۔ اگر (بفرض محال) یہ طریق، مطلوبہ نتائج پیدا نہ کر سکا تو اس سے ہمارا نقصان بہرحال کچھ نہیں ہوگا۔ یہ اقدار، طبعی قوت کے حصول، استحکام اور بقاء کے راستے میں حائل نہیں ہوتیں یہ اسے زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی تاکید کرتی ہیں۔ (فرق صرف اس کے محل استعمال میں ہوتا ہے) لہٰذا، انہیں آزمائشی طور پر اختیار کرنے سے بھی ہمارا کچھ نہیں بگڑتا۔ اس کے برعکس، اگر یہ کامیاب ثابت ہوگئیں (اور ان کے کامیاب ہونے میں کلام ہی کیا ہے) تو یہ ہمیں اس مقام پر پہنچا دیں گی جو اس وقت ہمارے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آ سکتا اور اس کے ساتھ ہی یہ عالمگیر انسانیت کو بھی اس جہنم سے نجات دینے کا موجب بن جائیں گی جس میں وہ اس وقت گرفتار ہے اور جس سے نکلنے کی اسے کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی۔ یاد رکھئے! جب تک ہم اپنے موجودہ (Pattern) کو نہیں بدلتے، ہمارے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہوسکتی۔ معاشی دنیا میں ہم، اپنے موجودہ معاشی نظام کی رو سے، سرمایہ دار قوموں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہمیں ہمیشہ ان کا دست نگر رہنا پڑے گا اور عمرانی دنیا میں ہم ''جنگل کے قانون'' کی بنا پر بالا دست اقوام مغرب کو چھو تک نہیں سکتے۔ ہم زندہ اور پائندہ رہ سکتے ہیں تو صرف اپنے نظام کی تبدیلی سے اور یہ تبدیلی مستقل اقدار خداوندی کی بنیادوں پر ہی عمل میں آ سکتی ہے۔ اس تبدیلی سے جو محیر العقول قوت حاصل ہوتی ہے اسے سمجھانے کے لئے ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح، شیر اور ہاتھی کی بے پناہ قوت، ایک انسانی بچے کی ذہنی فراست کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اسی طرح جنگل کے قانون پر ایمان رکھنے والی قوموں کی مجموعی طاقت بھی اس نظام کا مقابلہ نہیں کر سکتی جو انسانیت ساز اقدار پر متشکل ہوا ہو۔

یقیں پیدا کر اے غافل! کہ مغلوبِ گماں تو ہے

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قرآنی پاکستان کیسا ہوتا؟

اسلام‘ ایک زندہ نظامِ حیات بننے کے لئے اپنی آزاد مملکت کا متقاضی ہے۔ یہ وہ شرط ہے جس کے پورا نہ ہونے سے وہ‘ دیگر مذاہب کی طرح ایک مذہب بن کر رہ جاتا ہے‘ دین یعنی نظامِ حیات نہیں بن سکتا۔ (مثلاً) اس نظام کے بنیادی ستون اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہیں‘ اور اس کا اصل الاصول‘ امر بالمعروف ونہی عن المنکر۔ ہمارے مروجہ تصورِ اسلام کی رو سے‘ اقامتِ صلوٰۃ کے معنی ہیں صرف نماز پڑھنا اور ایتائے زکوٰۃ سے مفہوم‘ غریبوں اور گداگروں کو کچھ پیسے بطور خیرات دے دینا اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے مقصود ہے لوگوں کو وعظ ونصیحت کرنا۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی بات کے لئے بھی اپنی آزاد مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہ فرائض ہم‘ انگریز کے عہدِ غلامی میں بھی آزادانہ ادا کر سکتے تھے اور آج‘ بھارت کا مسلمان‘ بایں ہمہ بے بسی و بے کسی‘ انہیں اپنے طور پر ادا کر سکتا ہے لیکن قرآن کریم ان کی ادائیگی کے لئے‘ اپنی حکومت کا قیام‘ لازمی شرط قرار دیتا ہے۔ جہاں کہتا ہے کہ۔۔

> ''اسلامی نقطۂ نگاہ سے‘ مملکت اس کوشش کا نام ہے جس کی رو سے اسلام کے مثالی تصورات کو زمان ومکان کی قوتوں میں منتقل کیا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت ان بلند تصورات کو انسانی ہیئتِ اجتماعیہ میں منتقل کرنے کا نام ہے۔''

(مفہوم) یہ وہ لوگ ہیں‘ (یعنی جماعت مومنین) کہ جب انہیں حکومت ملے گی تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا انصرام کریں گے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کا فریضۂ حیات ہوگا۔ (22:41)۔ یا (مثلاً) مذہبی سطح پر اسلام سے مقصود یہ ہے کہ انسان خدا کی عبادت کرے اور شرک سے مجتنب رہے یعنی غیر اللہ کی پرستش نہ کرے۔ اس مقصد کے لئے بھی اپنی آزاد مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہ ہر مقام پر‘ ہر حال میں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن قرآن کریم میں ہے کہ دین کے تمکن کیلئے استخلاف فی الارض ضروری ہے‘ کیونکہ اس کے بغیر نہ خدا کی عبودیت اختیار کی جا سکتی ہے اور نہ شرک سے اجتناب ممکن ہے۔ سورہ نور میں ہے کہ خدا نے تم سے حکومت کا وعدہ کر رکھا ہے تا کہ تم اس کی عبودیت اختیار کر سکو اور شرک سے بچ سکو۔ یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَا یُشۡرِکُوۡنَ بِیۡ شَیۡـًٔا ط (24:55)۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا تو قبیلہ بنی عامر کا ایک بہت بڑا سردار آپ ﷺ کے پاس آیا اور اس دعوت کے مقاصد کے متعلق وضاحت چاہی۔ آپ ﷺ کی وضاحت پر اس نے پوچھا کہ اگر میں ان امور پر کاربند ہو گیا تو مجھے کیا ملے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جنت‘ یعنی باغ و بہارِ آخرت۔ ہمیشہ رہنے والی

زندگی۔۔اس نے کہا کہ یہ بعد کی بات ہے۔میں یہاں کے متعلق معلوم کرنا چاہتا ہوں۔اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ۔
نعم النصر و التمکین فی البلاد۔۔اس دنیا میں فتوحات اور حکومت حاصل ہوگی۔(الکامل)۔

اسلام کا تقاضا:

یہ تھا اسلام کے دین (یعنی زندہ نظام حیات) بننے کا تقاضا، جس کے پیش نظر علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

''اس سے اسلام، اپنی تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے گا اور انہیں عصر حاضر کی روح کے قریب تر لانے کے قابل بنا سکے گا۔'' (خطبہ الہٰ آباد، 1930ء)۔

اس سے بھی پہلے، انہوں نے اپنے خطبات میں اس حقیقت کی وضاحت کر رکھی تھی کہ:

''اسلامی نقطۂ نگاہ سے، مملکت اس کوشش کا نام ہے جس کی رو سے اسلام کے مثالی تصورات کو زمان ومکان کی قوتوں میں منتقل کیا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت ان بلند تصورات کو انسانی ہیئت اجتماعیہ میں منتقل کرنے کا نام ہے۔''

اس مملکت میں، عبادت نام ہوتا ہے قوانین خداوندی کی محکومیت اختیار کرنے کا اور شرک سے مفہوم ہوتا ہے انسانوں کے خودساختہ احکام وقوانین کی اطاعت۔اقامت صلوٰۃ سے مقصود ہوتا ہے ایک ایسے معاشرہ کا قیام جس میں تمام افراد معاشرہ، ان قوانین کا از خود، بہ طیب خاطر، اتباع کرتے جائیں اور ایتائے زکوٰۃ سے مفہوم ہوتا ہے تمام افراد معاشرہ (بلکہ عالمگیر انسانیت) کو سامان نشوونما مہیا کرنا۔اس میں امر بالمعروف کے معنی ہوتے ہیں ان احکام وضوابط کا نافذ کرنا جنہیں قرآن صحیح تسلیم کرتا ہے اور ان سے قانوناً روکنا جنہیں وہ مذموم قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں علامہ اقبالؒ نے لکھا تھا کہ:

> بت تو فارسی زبان کا لفظ ہے۔قرآن کریم میں اس کے لئے اوثان کا لفظ آیا ہے جو وثن کی جمع ہے اور وثن کے معنی ہوتے ہیں جمود و تعطل، عدم حرکت، جامد و غیر متحرک ہو جانا۔۔اس بنیادی مفہوم کے اعتبار سے ہر وہ تصور یا نظام جس میں حرکت نہ رہے اور جامد ہو جائے وثن ہے۔جب قرآنی ضابطۂ حیات کو عملی شکل دے دی جائے تو اس سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آتا ہے جو حرکت پیہم اور سعی مسلسل کا آئینہ دار ہوتا ہے

''اسلام، تخت وتاج سے وفا شعاری کا مطالبہ نہیں کرتا۔ وہ صرف خدا (کے قوانین) سے عہد وفا استوار کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔'' (خطبات)

اور قائداعظمؒ نے کہا تھا کہ:

''اسلامی حکومت میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام واصول ہیں۔اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست ومعاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔

اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول واحکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔'' (حیدرآباد دکن، 1941ء)

یہ ہے ایک اسلامی مملکت کی تخلیق وتشکیل کی وجہ جواز اور یہ تھی وہ بنیاد جس پر مطالبۂ پاکستان کی عمارت استوار کی گئی تھی اور جس کے لئے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا۔

لوحِ سادہ: آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جب اسلام کی انقلابی دعوت پیش کی تو اس میں مخالفین کے ساتھ سب سے بڑی وجۂ نزاع اور سب سے شدید سبب تصادم کیا تھا؟ انہیں زندگی کے اس نظام نو کی طرف دعوت دی جاتی تھی اور وہ اس کے جواب میں کہتے تھے۔ کہ: اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ (43:22)۔ ہم اس نئے نظام کو اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ہم اسی مسلک پر چلتے رہنا چاہتے ہیں جو ہمارے اسلاف سے ہم میں متوارث چلا آ رہا ہے۔ ہم انہی کے نقوش قدم کا اتباع کریں گے۔ ہم اپنی روایات کہنہ کو نہیں چھوڑنا چاہتے'۔ ان سے' اس کے جواب میں کہا جاتا کہ: اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ؕ (43:24)۔ جو کچھ تمہارے سامنے پیش کیا جاتا ہے اگر یہ اس سے بہتر ہو جس پر تم اپنے آباؤ واجداد کی تقلید میں چلے جا رہے ہو، تو کیا تم پھر بھی اپنے اسلاف کے مسلک ہی کو ترجیح دو گے؟ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہاں! ہم اسی مسلک کا اتباع کریں گے۔ ہمیں کسی نظام نو کی ضرورت نہیں حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ (5:104) وہ مسلک ہمارے لئے ہر اعتبار سے کافی ہے'۔۔ یہ تھی وہ بنیادی کشمکش جو اس قدر شدید تصادمات کا موجب بنی۔ جب ان مخالفین نے دیکھا کہ یہ نظام زور پکڑتا جا رہا ہے تو انہوں نے چاہا کہ اس سے کچھ مفاہمت کی صورت نکل آئے۔ یعنی کچھ باتیں اس نظام جدید کی لے لی جائیں اور کچھ ان کے مسلک آباء کی، اور دونوں کے امتزاج سے ایک نظام وضع کر لیا جائے۔ لیکن دین کے نقطۂ نگاہ سے ایسا کرنا شرک ہوتا اس لئے رسول اللہ ﷺ سے بتاکید کہہ دیا گیا کہ: وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (11:113)۔ دیکھنا! ان لوگوں کی طرف ذرا سا بھی جھک نہ جانا۔ اگر تم نے ایسا کیا، تو فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ تمہاری جماعت بھی اسی عذاب میں گرفتار ہو جائے گی جس میں یہ لوگ ماخوذ ہیں اور جس سے نکالنے کے لئے انہیں اس نظام کی طرف دعوت دی جا رہی ہے۔

> وہ کام جنہیں عام طور پر نیکی کہا جاتا ہے، محض تقلیداً کئے جائیں، تو یہ انسانی زندگی میں نشوو ارتقاء کا موجب نہیں بن سکتے۔ انسانی زندگی میں (Moral) تو خیر بڑی چیز ہے، اس میں (Immoral) ہونا اتنا تباہ کن نہیں جتنا ہلاکت آفریں (Amoral) ہونا ہے۔ تقلید میں انسان (Amoral) ہو جاتا ہے

لہٰذا، ایک قرآنی مملکت کی تشکیل کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ ان تمام نظریات حیات وتصورات زندگی، ان تمام روایات کہنہ اور مسالک قدیمہ کو الگ کر کے رکھ دیا جائے جو اس قوم میں متوارث چلے آ رہے ہیں۔ اس مملکت کا بنیادی پتھر۔۔ لا الٰہ الا اللہ۔۔ ہے۔ اس میں لا الٰہ کے معنی یہ ہیں کہ تمام متوارث تصورات کو الگ کر کے، ہر شے کا از سر نو جائزہ لیا جائے۔ اس کے

بغیر' اس جدید نظام کی عمارت (جس کی بنیاد الا اللہ پر استوار ہوتی ہے) قائم ہو ہی نہیں سکتی۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ ؎

ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند   اول آں بنیاد را ویراں کنند

اسلام میں ''بت پرستی'' کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ بت تو فارسی زبان کا لفظ ہے۔ قرآن کریم میں اس کے لئے اوثان کا لفظ آیا ہے جو وثن کی جمع ہے اور وثن کے معنی ہوتے ہیں جمود و تعطّل' عدم حرکت' جامد و غیر متحرک ہو جانا۔۔ اس بنیادی مفہوم کے اعتبار سے ہر وہ تصور یا نظام جس میں حرکت نہ رہے اور جامد ہو جائے وثن ہے۔ جب قرآنی ضابطۂ حیات کو عملی شکل دے دی جائے تو اس سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آتا ہے جو حرکت پیہم اور سعی مسلسل کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ''حرکت پیہم'' کے معنی یہ ہیں کہ وہ معاشرہ' قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے زمانہ کے بدلتے اور بڑھتے رہنے والے تقاضوں کا ساتھ دیتا چلا جاتا ہے۔ یوں یہ نظام ایک ذی حیات تحریک (Dynamic Movement) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اگر یہ کسی ایک مقام پر رک جائے' اس میں جمود پیدا ہو جائے تو یہ وثنیت ہوگی۔ یہ وہ وثن (بت) ہے جس کی پرستش وہ قومیں کرتی ہیں جن پر ذہنی جمود اور عملی تعطل چھا چکا ہو۔ حیرت ہے کہ ہم نے قرآن کے اس عظیم نقطہ کو پس پشت ڈال دیا اور مغرب کے مفکرین کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ چنانچہ ''وہائیٹ ہیڈ'' لکھتا ہے کہ:

''بت پرستی کی کنہ و حقیقت مروجہ خداؤں پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا ہے۔'' (ایڈونچر آف آئیڈیاز' ص 12)۔

اس قسم کی بت پرستی میں' ایک زندہ اور متحرک نظام حیات کے تصورات و مناسک کی محض شکلیں باقی رہ جاتی ہیں' ان کے معانی و مفہوم ختم ہو جاتے ہیں۔ مذہب' دین کی ممی شدہ لاش ہوتا ہے۔ ان بے روح رسوم' اور بے جان معتقدات سے چپکے رہنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کے متعلق وہائٹ ہیڈ کہتا ہے کہ:

''زندگی کے بے جان پیکروں کے ساتھ چپکے رہنے کا نتیجہ سست رفتار زوال ہوتا ہے جس میں ان رسوم کو بلا نتیجہ دہرایا جاتا ہے...... اس سے تہذیب و ترقی کا محض سراب باقی رہ جاتا ہے۔ حقیقت غائب ہو جاتی ہے۔''

(ایڈونچر آف آئیڈیاز' ص:358)

انسان اور حیوان میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ حیوان' بلا سوچے سمجھے اور بلا اختیار و ارادہ' اپنے اسلاف کے مسلک پر چلے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں آگے بڑھنے' اور کچھ اور بننے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے بکری کا بچہ بکری ہی بن سکتا ہے اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ انسانی تاریخ میں ایسے ادوار آتے رہے جن میں تقلید کی ان برفانی سلوں کو توڑ کر کاروان انسانیت کے لئے آگے بڑھنے کا راستہ ہموار کیا گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج کا انسان بھی' اپنے اسلاف کی طرح' غاروں میں پڑا زندگی بسر کرتا۔ یاد رکھئے۔ جوہر زندگی کی نمود' اپنے اختیار و ارادہ اور فکر و بصیرت سے' تعمیری کام سرانجام دینے سے ہوتی ہے۔ اگر وہ کام جنہیں عام طور پر نیکی کہا جاتا ہے' محض تقلیداً کئے جائیں' تو یہ انسانی زندگی میں نشوو ارتقاء کا موجب نہیں بن سکتے۔ انسانی زندگی میں (Moral) تو خیر بڑی چیز ہے' اس میں (Immoral) ہونا اتنا تباہ کن

نہیں جتنا ہلاکت آفریں (Amoral) ہونا ہے۔ تقلید میں انسان (Amoral) ہو جاتا ہے۔

یہی وہ جمود ہے جسے توڑنے کے لئے اقبال کہتا ہے کہ: ؎

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش — براہ دیگراں رفتن عذاب است

گر از دستِ تو کارے نادر آید! — گناہے ہم اگر باشد ثواب است

قرآن کریم نے' اپنا تعارف کراتے' یا یوں کہئے کہ اپنے نزول کا مقصد بتاتے ہوئے کہا ہے کہ: اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ (97:1) یعنی قرآن دنیا میں نئی اقدار لایا ہے اس کی آمد سے ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے تمام قدیم پیمانے الٹ گئے ہیں اور ان کی جگہ ان نئے پیمانوں نے لے لی ہے۔ قرآن کی اولین مخاطب قوم کی طرف سے جو اس کی مخالفت ہوئی تھی تو اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اپنے قدیم پیمانوں کو' جو ان کے اسلاف کی طرف سے متوارث چلے آ رہے تھے' ان جدید پیمانوں سے بدلنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اقبالؔ نے جب پاکستان کا تصور دیا تھا تو اس مملکت کو وجود میں لانے کا مقصد یہ بتایا تھا کہ:

''اس سے اسلام کو ایسا موقعہ میسر آ جائے گا جس سے یہ اس ٹھپہ کو مٹا سکے گا جو عرب ملوکیت نے زبردستی اس پر لگا رکھا ہے۔'' (خطبہ الٰہ آباد)۔

روشِ کہن: ہمارا مروجہ مذہب' ہماری شریعت' ہمارا کلچر' ہماری روایات' ہمارا فلسفۂ حیات' ہمارے رسوم و مناسک' غرضیکہ ہر وہ شے جسے ہم اس وقت عام طور پر اسلامی کہہ کر پکارتے ہیں' عرب ملوکیت کے دور کی پیدا کردہ ہے۔ اقبال نے اس کے لئے ''عجمی اسلام'' کی اصطلاح وضع کی تھی کیونکہ یہ پیدا تو عرب ملوکیت کے زمانہ (بالخصوص دورِ عباسیہ) میں ہوا تھا' لیکن تھا عجم سے مستعار لئے ہوئے تصورات کا مجموعہ۔ اسی لئے حکیم الامت نے مروجہ اسلام پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ ؎

شریعت' طریقت' تصوف' کلام — بتانِ عجم کے پجاری تمام

پاکستان کی تشکیل سے مقصد' ان ''بتانِ عجم'' کو حریم کعبہ سے نکال کر' اسے خالصتہً ''خدا کے گھر'' میں تبدیل کرنا تھا۔ یعنی ہمارے ہاں ''جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے'' اس کا قرآن کی روشنی میں جائزہ لے کر معاشرہ کو از سرِنو مستقل اقدار خداوندی کے خطوط پر متشکل کرنا۔

مذہبی پیشوائیت: ''بتانِ عجم'' کے یہ پجاری ہمارے مذہبی پیشوا ہیں۔ آپ کو معلوم ہے (اور قرآن اس حقیقت کو بار بار سامنے لاتا ہے) کہ قرآنی نظام کی دعوت کی شدید ترین مخالفت' اہل کتاب کے مذہبی پیشواؤں کی طرف سے ہوئی تھی۔ مذہبی پیشوائیت' ماضی کی کہنہ اور فرسودہ روایات کے محافظ ہونے کے مقدس سہاروں سے قائم رہتی ہے اور ان روایات کے ختم ہو جانے سے ان کا اپنا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ وہ روایات کو زندہ اس لئے رکھنا چاہتی ہے کہ ان کی زندگی سے خود ان کی اپنی زندگی وابستہ ہوتی ہے۔ ورنہ انہیں ان روایات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ان کی کیفیت یہی ہوتی ہے کہ ؎

حکایتِ قدِ آں یارِ دلنواز کنم — بایں بہانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

قرآنی نظام میں جب یہ فرسودہ روایات ہی باقی نہیں رہتیں تو اس میں مذہبی پیشوائیت کیسے باقی رہ سکتی ہے۔ یہی وجہ

ہے کہ آپ کو نبی اکرم ﷺ اور خلافت راشدہ کے زمانہ میں مذہبی پیشوائیت کا نام تک نہیں ملتا۔ اس نظام میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر حکومت کا فریضہ تھا جو قرآنی معروفات کو قانوناً نافذ کرتی' اور اس کے برعکس اقدامات کو قانوناً روکتی تھی۔

قرآنی پاکستان میں زندگی کو ایک لوح سادہ (Clean Slate) سے شروع کیا جاتا جس میں فرسودہ عجمی تصورات کی قبروں کے مجاوروں کے لئے کوئی گنجائش نہ ہوتی اور ملت پاکستانیہ' حضور نبی اکرم ﷺ کے ان الفاظ گرامی کو پورے حزم و یقین اور کامل وثوق واعتماد کے ساتھ' ببانگ دہل دنیا کے سامنے دہرا سکتی جنہیں آپ نے اپنے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا تھا کہ:

الا۔ کل شئی من امر جاھلیت تحت قدمی موضوع۔

ہاں! زمانۂ جاہلیت کے تمام آئین ودستور میرے پاؤں کے نیچے پامال ہیں۔

قرآنی پاکستان' اس عظیم انقلابی اعلان کی نشر گاہ ہوتا۔ اسی کے لئے اقبالؒ نے کہا تھا۔ کہ ؎

وقت آنست کہ سامانِ سفر تازہ کنیم   لوحِ دل پاک بشوئیم و ز سر تازہ کنیم

حاکم ومحکوم کا امتیاز: قرآنی مملکت میں' حاکم اور محکوم کا تصور نہیں ہوتا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اس مملکت کا بنیادی فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ قرآن کریم نے یہ فریضہ امت کے کسی خاص گروہ کا قرار نہیں دیا' بلکہ ساری کی ساری امت کا قرار دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (3:110)۔ تم وہ بہترین امت ہو جسے ہم نے نوع انسان کی بہبود کے لئے متشکل کیا ہے۔ تمہارا فریضہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہے۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے' تقسیم عمل کے اصول کے مطابق' مختلف کام مختلف افراد کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں۔ گویا یہ ایک ٹیم ہوتی ہے جو باہمی تعاون سے زندگی کو اس کی منزل مقصود تک لے جاتی ہے۔ اس میں' افسر اور ماتحت یا حاکم اور محکوم کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ الدین' یعنی قرآنی نظام کی خصوصیت کبریٰ یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ؕ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ (82:19) کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر نہ کسی قسم کا کوئی کنٹرول یا حق حکومت رکھے' نہ کوئی کسی دوسرے کا محتاج ہو۔ اس میں تمام معاملات قوانین خداوندی کے مطابق طے پاتے چلے جائیں۔ اس میں کسی کو اس کا حق نہیں ہوتا کہ دوسرے سے کہے کہ: كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ (3:79) تم میرے محکوم ہو جاؤ۔۔ نہ کسی کا کوئی محکوم نہ محتاج۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس   نکتۂ شرعِ مبیں' این است و بس

جب عہدِ فاروقی میں روم کا سفیر مدینہ آیا اور اس نے دریافت کیا کہ تمہارا بادشاہ کون ہے' تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنھم کی طرف سے اس کا جواب یہ ملا تھا کہ۔۔ مالنا ملك. بل لنا امیر۔۔ ہمارا بادشاہ کوئی نہیں' ہمارا صرف امیر ہے۔ واضح رہے کہ لفظ امیر کے بنیادی معنی مشورہ کرنے والے یا راہنمائی کرنے والے کے ہیں۔ امت' جس شخص کے سپرد یہ امانت کرتی ہے' اس کا فریضہ کیا ہوتا ہے' اس کے متعلق امت کے سب سے بڑے منتخب کردہ امیر' صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنھم نے اپنے

پہلے خطبہ ٔ خلافت میں‘ ان الفاظ میں وضاحت کردی تھی کہ:

’’یاد رکھو! تم میں سے ہر کمزور‘ طاقت ور ہے جب تک میں اس کا حق نہ دلاؤں اور ہر طاقتور کمزور ہے جب تک اس سے کمزور کا حق نہ لے لیا جائے۔‘‘

اس فریضہ کو حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں دہرایا تھا کہ:

’’یاد رکھو! اگر کوئی شخص کسی پر زیادتی کرے گا تو میں اس وقت تک اسے نہیں چھوڑوں گا جب تک اس کا ایک رخسار زمین پر ٹکا کر دوسرے رخسار پر پاؤں نہ ٹکادوں۔ تا آنکہ وہ حق کے سامنے سپر انداز ہوجائے۔ لیکن تم میں سے حقدار کے لئے میں اپنا رخسار زمین پر رکھ دوں گا۔‘‘

خلافت اور ملوکیت میں فرق: وہ اکثر لوگوں سے دریافت کرتے رہتے کہ میں کہیں خلافت سے روگردانی کر کے بادشاہت کی طرف تو نہیں جارہا؟ ایک دفعہ جب انہوں نے یہی سوال دہرایا تو ایک شخص نے جواب میں کہا کہ خلافت اور بادشاہت کا فرق بڑا نمایاں ہے اس لئے اس میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں ہوسکتا کہ ہمارے ہاں خلافت ہے یا بادشاہت۔ خلیفہ تمام افراد معاشرہ کے حقوق کا محافظ ہوتا ہے اور بادشاہ ان کے حقوق میں ظلم اور جبر کرتا ہے۔ وہ ایک طرف سے لوٹتا ہے اور دوسری طرف (اپنے مقاصد کے لئے) خرچ کرتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ خلیفہ ہیں‘ بادشاہ نہیں۔

انہوں نے اپنے پہلے خطبہ میں کہا تھا کہ:

’’لوگو! میرے اوپر تمہارے جو حقوق ہیں‘ میں ان کی وضاحت کرتا ہوں۔ تمہارا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ تمہارے اموال میں سے کوئی چیز نہ لوں مگر قانون خداوندی کے مطابق اور جو کچھ لوں‘ اس میں سے کچھ خرچ نہ کروں مگر حق کے مطابق۔‘‘

اور یہ بھی کہا تھا کہ:

’’تمہارا مجھ پر یہ بھی حق ہے کہ جب تم مہمات کے سلسلہ میں اپنے بچوں سے دور ہوجاؤ تو میں ان بچوں کا باپ بنوں۔‘‘

وہ کہا کرتے تھے کہ میری اور دیگر افراد معاشرہ کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پارٹی سفر کے لئے نکلے تو سب لوگ اپنے پیسے ایک شخص کے سپرد کردیں کہ وہ سفر کے سلسلہ میں ضروری اخراجات کرتا جائے اور اس کا حساب رکھے۔۔۔ لہٰذا‘ مسلمانوں کے مال میں میرا حصہ اتنا ہی ہے کہ کپڑوں کے دو جوڑے۔ ایک گرمی کا اور ایک سردی کا۔ اور میرے اور میرے اہل وعیال کے لئے اتنا کھانا جو قریش کے ایک عام آدمی کی خوراک ہے۔

بیوی بچے فتنہ نہ بن جائیں: اہل وعیال کے معاملہ میں ایک طرف قرآن نے انہیں زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (18:46)۔۔ کہا ہے۔ انہیں آنکھوں کی ٹھنڈک قُرَّةَ اَعْيُنٍ (25:74)۔۔ کا موجب قرار دیا ہے لیکن دوسری طرف یہ بھی بتادیا ہے کہ یاد رکھو۔ اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (8:28)۔ یہ انسان کے لئے بہت بڑی آزمائش کا موجب بن جاتے ہیں اور مقاصد حیات میں تمہارے سب سے بڑے دشمن۔ اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ (64:14) ’’یاد رکھو! تمہاری اولاد اور بیویاں بعض اوقات تمہاری سب سے بڑی دشمن ہوتی ہیں۔‘‘

تمہاری زندگی کے بڑے بڑے بلند مقاصد انہی کے ہاتھوں تباہ ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے تمہارے پاؤں میں ایسی لغزش آتی ہے کہ تم اپنے مقام بلند و رفیع سے گر کر چکنا چور ہو جاتے ہو۔ اس لئے فَاحْذَرُوْهُمْ ان سے بہت محتاط رہنا۔ قرآنی مملکت میں اس لغزش کی گھائی کو ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رکھا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کی ایک بیوی تھی جسے ان کے مزاج میں بڑا دخل تھا۔ جب امور خلافت ان کے سپرد ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ امور مملکت میں دخیل ہوتی ہے اور بعض اوقات غلط سفارشات کر دیتی ہے۔ جب اس نے تنبیہہ کے باوجود اپنی اس عادت کو نہ بدلا تو آپ نے اسے طلاق دے دی۔ اولاد کے بارے میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ عراق کے گورنر (حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ) نے ان کے دولڑکوں (جناب عبداللہ اور عبیداللہ) کو کچھ رقم خزانہ میں داخل کرنے کے لئے دی۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہم اس رقم کو قرض سمجھ کر اس سے تجارت کرلیں اور پھر اصل رقم بیت المال میں جمع کرادیں تو اس کی اجازت ہے؟ انہوں نے اجازت دے دی۔ جب حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے کہا کہ اس مال کی تجارت سے جو منافع ہوا ہے وہ بھی بیت المال میں داخل کرنا ہوگا۔ بیٹوں نے کہا کہ گورنر نے انہیں اس کی اجازت دے دی تھی۔ اس پر آپ نے پوچھا کہ کیا اس نے کسی اور کو بھی اس قسم کی اجازت دی تھی؟ یا تمہارے ہی ساتھ یہ رعایت برتی تھی۔ انہوں نے کہا کہ کسی اور کو تو اس قسم کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اس پر آپؓ نے کہا کہ اس نے یہ رعایت تمہیں امیر المومنین کے بیٹے ہونے کی وجہ سے دی ہے اور یہیں سے فساد کی ابتدا ہوا کرتی ہے۔ قرآنی مملکت میں ایسا نہیں ہوسکتا۔ اس لئے میں اپنے فیصلے کو واپس نہیں لینا چاہتا۔۔ اس باب میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب وہ امہات المومنینؓ (یعنی رسولؐ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات) کو بیت المال سے کوئی چیز بطور تحفہ بھیجتے تو حضرت حفصہؓ کا حصہ آخر میں لگاتے کہ اگر مقدار میں کچھ کمی رہ جائے تو وہ ان کے حصہ میں ہو۔ یہ اس لئے کہ حضرت حفصہؓ، حضرت عمرؓ کی بیٹی بھی تھیں۔۔ قحط کے زمانے میں آپ نے گلی میں ایک بچی کو دیکھا کہ بھوک سے نڈھال ہو رہی ہے۔ آپ کو اس سے بڑا صدمہ ہوا۔ کہا کہ کوئی پہچانتا ہے کہ یہ بچی کون ہے؟ بیٹا ساتھ تھا۔ اس نے کہا کہ یہ آپ کی پوتی (فلاں) ہے۔ آپ نے کہا کہ اس کی حالت ایسی کیوں ہو رہی ہے۔ اس نے کہا کہ قحط کی وجہ سے جتنا کچھ ملتا ہے اس میں یہ حالت نہ ہوگی تو اور کیا ہوگا۔۔؟ آپ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور کہا کہ پھر جو حال قوم کے دوسرے بچوں کا وہی عمر کی پوتی کا ہوگا۔ تنگی ہوگی تو سب پر اور کشادگی ہوگی تو سب کے لئے۔۔ انکا دستور تھا کہ

''جب مملکت میں کوئی امتناعی حکم نافذ کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کر کے ان سے کہتے کہ میں نے فلاں فلاں چیز سے منع کیا ہے۔ اور لوگ تمہاری طرف ایسے دیکھ رہے ہیں جیسے پرندے گوشت کی طرف۔۔ اگر تم محتاط رہو گے تو وہ بھی رہیں گے۔ اور اگر تم میں سے کسی نے ایسا کیا تو (اس کی وجہ سے کہ تمہارے اعمال کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے) تمہیں ان سے دگنی سزا دوں گا۔ اب تمہارا اختیار ہے۔ چاہے آگے بڑھو اور چاہے پیچھے ہٹو۔'' (تاریخ عمرؓ۔ ابن جوزی)

عدل: قرآنی مملکت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر ایک سے عدل ہوتا ہے۔ عدل کی ایک شکل یہ ہے کہ ہر متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ قانون کے مطابق کیا جائے۔ اور اس میں کسی کی رورعایت نہ کی جائے۔ یہی ہے وہ مملکت جس

میں ہر صاحبِ اختیار سے یہ کہا جاتا ہے کہ: اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى (38:26) تمہیں مملکت میں صاحبِ اختیار اس لئے بنایا گیا ہے کہ تم لوگوں کے فیصلے حق کے ساتھ کرو اور اس میں اپنے جذبات کو کبھی دخیل نہ ہونے دو۔

یہاں کہا گیا ہے کہ لوگوں کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ حق کے ساتھ کرو۔ یہ نکتہ بڑا غور طلب ہے۔ عدل کا عام تصور یہی ہے کہ اگر معاملات کا تصفیہ ملک کے رائج الوقت قانون کے مطابق ہو تو کہا جائے گا کہ عدل کا تقاضا پورا ہو گیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر خود وہ قانون، جس کے مطابق فیصلہ ہوا ہے، عدل پر مبنی نہیں ہو گا تو اس کے مطابق فیصلہ کو مبنی بر عدل کیسے کہا جائے گا؟ اگر قانون کے استعمال میں جذبات اثر انداز ہو سکتے ہیں تو قانون سازی میں جذبات کیوں اثر انداز نہیں ہو سکتے! یہ وجہ ہے کہ قرآنی مملکت میں قانون سازی کا اختیار کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس میں تمام قوانین، اصولی طور پر، خدا کے متعین فرمودہ (قرآن کی دفتین کے اندر محفوظ) ہوتے ہیں اور مملکت کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان قوانین کو اپنے زمانے کے حالات کے مطابق نافذ العمل بنائے۔ قرآن کریم کا تعارف، سب سے پہلی آیت میں، الکتاب کہہ کر کرایا گیا ہے۔ الکتاب ضابطۂ قوانین کو کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں چند ایک قوانین تفصیلی طور پر دیئے گئے ہیں اور باقی تمام قوانین اصولی طور پر درج ہیں۔ ان اصولی قوانین کی جزئیات، ہر زمانے کی امت، اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، باہمی مشاورت سے مرتب کرے گی۔ ان جزئیات (یا بائی لاز) میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق تغیر و تبدل ہوتا رہے گا۔ لیکن اصولی قوانین ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔ ان میں تبدیلی کا حق کسی ایک فرد یا پارلیمان تو ایک طرف، ساری دنیا کی آبادی کو بھی حاصل نہیں ہو گا۔ جو مملکت، قرآنی قوانین کے مطابق فیصلے کرے گی اسے اسلامی مملکت کہا جائے گا۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5:44)۔

جو خدا کی طرف سے نازل کردہ کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

لہٰذا، قرآنی مملکت میں ہر فیصلہ قرآنی قوانین کے مطابق ہوتا ہے اور ان قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے میں، نہ فیصلہ کرنے والے کے ذاتی رجحانات و میلانات اثر انداز ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کے خارجی موثرات دخیلِ کار:

اس دور میں کوئی شخص (قانون کے مقابلہ میں) کسی دوسرے شخص کے کام نہیں آ سکے گا۔ نہ ہی کسی کی سفارش مجرم کو بچا سکے گی، نہ ہی اس سے کچھ لے لوا کر اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ نہ ہی کوئی کسی اور طرح مجرم کی مدد کر سکے گا۔ (2:48)۔

اس میں مجرم چھپا نہیں رہ سکتا، دور سے پہچانا جا سکتا ہے۔ ''اس میں مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے۔'' (55:41)۔ اس میں انتظام ایسا ہوتا ہے کہ مجرم، شریف انسانوں سے بالکل الگ نظر آئیں۔ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ (32:59) تاکہ کوئی ایسے لوگوں سے دھوکا نہ کھا سکے۔ اس میں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی مجرم، مواخذہ سے بچ جائے یا کوئی بے گناہ یونہی دھر لیا جائے۔ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا (6:164)۔ اس میں ہر شخص اپنے اعمال کے مطابق بدلہ پاتا ہے وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (6:164) اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

قرآنی مملکت میں، بڑی سے بڑی شخصیت بھی قانون کے دائرے سے باہر نہیں ہوتی۔ اس باب میں، اور تو اور، خود حضور رسالتماب ﷺ کی زبان اقدس سے بھی یہ اعلان ہوتا ہے کہ:

اگر میں بھی قانون خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو اس کے مواخذہ سے سخت ڈرتا ہوں (6:15)۔

اور اس کے بعد فرمادیا کہ اگر میری چہیتی بیٹی۔۔ فاطمہؓ۔۔ بھی قانون شکنی کرے تو میں اسے بھی سخت سزا دوں گا۔ جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ مصر کے گورنر نے، ان کے بیٹے کو وہ سزا جو پبلک کے سامنے دینی چاہئے تھی، پرائیویٹ مکان میں دی ہے، تو آپ نے بیٹے کو مدینہ بلوا کر، اسے از سرِ نو پبلک میں سزا دی۔۔ جب اسی مصر کے گورنر کے بیٹے نے ایک مصری کو کسی بات پر یہ کہہ کر ہنٹر سے پیٹا کہ تم بڑے آدمیوں کی اولاد سے گستاخی سے پیش آتے ہو، تو آپ نے، گورنر، اس کے بیٹے، اور اس مصری کو مدینہ بلوا بھیجا۔ مصری کے ہاتھ میں ہنٹر دیا اور کہا کہ اسے اسی طرح مارو اور کہو کہ تم نے دیکھ لیا کہ بڑوں کی اولاد کا حشر کیا ہوتا ہے؟ اس کے ساتھ ہی اس گورنر کو بھی تادیب کی کہ اگر تم نے بیٹے کی تربیت صحیح کی ہوتی تو اس کے سر میں یہ خناس کیوں سماتا، کہ وہ بڑوں کی اولاد ہے اس لئے اسے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا حق حاصل ہے۔ خود حضرت عمرؓ کو ایک مرتبہ ایک عدالت میں پیش ہونے کا اتفاق ہوا تو جج نے انہیں امتیازی مقام پر بیٹھنے کی پیشکش کی، آپ نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا اور مدعی کے برابر بیٹھ گئے مقدمہ ختم ہونے کے بعد، آپ نے جج کو لکھا کہ تم جج بننے کے قابل نہیں ہو سکتے جب تک تم امیر المومنین اور ایک عام شہری کو یکساں نہ سمجھو۔

قرآنی مملکت میں یہ کیفیت تو عدالت کی ہوتی ہے۔ لیکن اس میں مناسب تعلیم و تربیت سے خود افراد معاشرہ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر ان سے کبھی کوئی لغزش سرزد ہو جائے تو وہ خود اپنے آپ کو اپنے جرم کی سزا کے لئے پیش کر دیتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کا ایمان یہ ہوتا ہے کہ ارتکاب جرم کا کوئی اور شاہد ہو یا نہ ہو، خود خدا کا قانون مکافات عمل سب سے بڑا گواہ ہوتا ہے۔ وہ گواہ جس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ:

وہ نگاہ کی خیانت اور دل کے اندر گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہوتا ہے (40:19)۔

یہی تھی وہ تعلیم جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک رات حضرت عمرؓ، حسبِ دستور، افراد معاشرہ کے حالات کا براہ راست مطالعہ کرنے کے لئے گشت کر رہے تھے کہ آپ نے سنا کہ ایک خیمہ کے اندر، ماں اپنی بیٹی سے کہہ رہی ہے کہ دودھ میں تھوڑا سا پانی ملا کر اسے چولہے پر چڑھا دو۔۔ بیٹی نے کہا کہ امی! میں دودھ میں پانی نہیں ڈالوں گی، کیوں کہ خلیفہ نے اس سے منع کیا ہے۔ ماں نے جواب دیا کہ پانی ڈال دو، خلیفہ اس وقت کہاں دیکھ رہا ہے۔ لڑکی نے کہا کہ خلیفہ تو نہیں دیکھ رہا لیکن وہ خدا تو دیکھ رہا ہے جس کا حکم خلیفہ نے ہم تک پہنچایا تھا۔

خلیفہ نے گھر آ کر بیوی سے کہا کہ صبح اس خیمہ میں جاؤ اور اس لڑکی کی ماں سے لڑکی کا رشتہ مانگ لو۔ ایسی بچی جس گھر میں آ جائے گی وہ گھر نور سے بھر جائے گا۔

پہل کہاں سے ہو؟: لیکن افراد معاشرہ میں اس قسم کی تبدیلی اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب پہلے برسرِ اقتدار

طبقہ خود اپنے کیریکٹر میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرے۔ لوگ قانون کی اطاعت کرتے ہی اس وقت ہیں جب ان کے ارباب حل وعقد خود قانون کی اطاعت کریں۔ اسی طبقہ کے بگڑنے سے ساری قوم بگڑتی ہے اور اسی کے سنورنے سے ساری قوم سنو رجاتی ہے۔ جب حضرت صالح علیہ السلام کو قوم ثمود کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا تو آپ نے دیکھا کہ قوم تمام کی تمام بگڑی ہوئی ہے' اس کی اصلاح کی صورت کیا ہوگی؟ تو خدا کی طرف سے جواب ملا کہ گھبرانے کی بات کوئی نہیں۔ وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ (27:48) مملکت کے مرکز میں قوم کے نوسرغنے ہیں اور وہی سارے فساد کا موجب ہیں اور قوم کے معاملات کو سنورنے نہیں دیتے۔ اگر وہ راہ راست پر آجائیں تو ساری قوم سنور جائے گی۔ یہی تھی وہ حقیقت جسے حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:

عوام میں اس وقت تک ٹیڑھ پیدا نہیں ہوتی جب تک ان کے لیڈر سیدھے رہتے ہیں۔ جب تک راعی اللہ کی راہ میں چلتا ہے' رعایا اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ جہاں اس نے پاؤں پھیلائے' رعایا اس سے پہلے پاؤں پھیلا دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآنی مملکت میں' امیر کی اطاعت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ قوانین خداوندی کی اطاعت کرے۔ قرآن کریم نے اس باب میں واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ: وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا جو ہمارے قوانین کو فراموش کر دے۔ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۔ اور اپنے مفاد اور جذبات کے پیچھے لگ جائے۔ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (18:28)۔ اور یوں اس کے معاملات قاعدے اور قانون کی حدود سے تجاوز کر جائیں' تو اس کی اطاعت مت کرو۔ اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ:

اگر ایک ناک کٹا' سیاہ فام حبشی بھی تمہارا امیر ہو' تو جب تک وہ کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے' تم اس کے حکم کو سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ (مسلم)

اسی اصول کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے پہلے خطبہ خلافت میں' ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ:

تم میری اطاعت اس وقت تک کرو جب تک میں اللہ کے احکام کی اطاعت کروں۔ اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت فرض نہیں۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے ان الفاظ میں دہرایا تھا کہ:

یاد رکھو! کوئی صاحب اختیار دنیا میں اس مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا کہ وہ اگر خدا کے قوانین کی خلاف ورزی کرے تو اس کی اطاعت کی جائے۔

یہ اس لئے کہ قرآنی مملکت میں اطاعت صرف قوانین خداوندی کی ہوتی ہے' کسی انسان کی نہیں۔ ان کا امیر ان قوانین کے مطابق معاشرہ متشکل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر وہ خود ہی ان قوانین کی اطاعت نہ کرے' تو دوسرے اس کی اطاعت کس طرح کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظام کے داعی اول۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرما دیا کہ: اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (6:163) سب سے پہلے میں خود اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں۔

اس مقام پر اس نکتہ کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ امیر کی اطاعت اس وقت تک ہے جب تک وہ قوانین خداوندی کی اطاعت کرے' تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر ایک کو اس کا اختیار دے دیا جائے کہ جس وقت وہ سمجھے کہ امیر نے خدا کے کسی حکم کی اطاعت نہیں کی' وہ بغاوت کے لئے اٹھ کھڑا ہو۔ اس سے تو انارکی پھیل جاتی ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ قرآنی مملکت کے آئین میں اس قسم کا ضابطہ ہو گا جس کی رو سے خود امیر مملکت کے اقدامات پر نگاہ رکھی جائے گی اور جونہی وہ حد سے تجاوز کرے' آئینی اور قانونی طور پر اس کا مواخذہ ہو سکے گا اور اگر وہ مجرم ثابت ہو گا تو اس کی جگہ دوسرا امیر مقرر کر دیا جائے گا۔

سوشل جسٹس: یہ تھا عدل۔۔ یعنی قانون کے مطابق چلنے کا ایک گوشہ۔۔ اس کا دوسرا گوشہ وہ ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں عدل عمرانی (Social Justice) کہا جاتا ہے۔ سوشل جسٹس کی اصطلاح آج کل بڑی عام ہو رہی ہے اور اس کا ہر جگہ چرچا سنائی دے گا۔ لیکن اس اصطلاح کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اس کے متعلق ابھی تک متفق علیہ کچھ نہیں کہا گیا۔ یہ اصطلاح بھی' سوشلزم کی طرح' ہر ذہن میں الگ مفہوم کی حامل ہے۔ بنیادی طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس سوسائٹی کو مبنی بر عدل (Just) کہا جائے گا جس میں ہر فرد کو وہ کچھ مل جائے جس کا وہ حقدار ہے۔ لیکن یہیں سے پھر دوسرا سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ کس طرح متعین کیا جائے کہ کوئی شخص کسی چیز کا حقدار ہے۔ مختلف افراد کے حق (یا واجب۔۔ Due) کا تعین' پہلے سوال سے بھی زیادہ مشکل ہے اور اسی سے ساری پیچیدگیاں ابھرتی ہیں۔ ایک طرف سے جواب ملتا ہے کہ ایک شخص صرف اس کا حقدار ہے جو اسے معقول اخلاقی اصولوں (Valid Moral Principles) کے مطابق ملے۔ لیکن یہ اخلاقی اصول کیا ہیں' یہ سوال پھر بحث طلب رہ جاتا ہے۔ اس موضوع پر جو کچھ اس وقت تک میری نظروں سے گذرا ہے' اس میں (Emil Brunner) کا پیش کردہ مفہوم میرے نزدیک سب سے زیادہ صحیح ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی بر عدل (Just) اور فلاں ظلم پر مبنی (Unjust) ہے' وہ درحقیقت کہتا یہ ہے کہ عدل اور ظلم کے ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین' معاہدات' رسوم و رواج سے ماوراء ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جا سکتے ہیں۔ یا تو اسے تسلیم کرنا ہو گا کہ عدل کے لئے اس قسم کا مطلق' الوہیاتی معیار موجود ہے' ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا۔ جو ایک کے نزدیک قابل قبول ہو گا اور دوسرے کے نزدیک ناقابل تسلیم۔ عدل کے لفظ سے مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہو گا جس کے ساتھ حق مطلق ہونے کی تقدیس شامل ہو گی اور یا پھر یہ محض جھوٹے نگوں کی میناکاری اور ملمع سازی ہو گی۔

(Justice and The Social Order)

رزق کا حق: قرآن کی رو سے عدل کی تعریف اسی قسم کی ہے۔ یعنی کسی شخص کو وہ کچھ مل جانا جس کا وہ' از روئے قوانین خداوندی حقدار ہے' عدل کہلائے گا اور یہ قوانین' قرآن کے اندر موجود ہیں۔ لہٰذا' قرآن کی رو سے سوشل جسٹس کے معنی ہوں گے' ہر شخص کو اس کا قرآنی حق ادا کر دینا۔ قرآنی مملکت اس قسم کے سوشل جسٹس کو عملاً بروئے کار لانے کی ایجنسی ہے۔ ان ابدی اور غیر مشروط حقوق میں قرآن نے سب سے پہلے' ہر ذی حیات کے لئے رزق کا حق شامل کیا ہے۔ رزق کے معنی ہیں

تمام وہ سامان اور ذرائع جن سے انسان کی جسمانی پرورش اور اس کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے۔ اس حق کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ:

(مفہوم) سطح ارض پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔ (11:6)۔

قرآنی مملکت، جو خدا کے نام پر قائم ہوتی ہے، خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا فریضہ اپنے اوپر لیتی ہے۔ اس لئے تمام افراد معاشرہ سے واضح الفاظ میں کہتی ہے کہ:

(مفہوم) (تم مطمئن ہو کر بلند مقاصد حیات کے حصول کے لئے کوشاں رہو) ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔ (6:152)۔

ہمارے ہاں یہ بحث اکثر وجہ نزاع بنی رہتی ہے کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟ وہ سرمایہ دارانہ ہے، رفاہی ہے یا اشتراکی۔۔ لیکن ہم اگر قرآنی مملکت کی اس عظیم ذمہ داری کو سامنے رکھیں جسے مندرجہ بالا آیت میں متعین کیا گیا ہے تو بات نکھر کر سامنے آجاتی اور سارا مسئلہ صاف ہو جاتا۔ اسلام میں معاشی نظام کا انداز کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ وہ مقصود بالذات نہیں۔ سوال سارا یہ ہے کہ وہ ذمہ داری جسے مملکت اپنے سر پر لیتی ہے وہ کس طرح کے معاشی نظام سے پوری ہو سکتی ہے۔۔ یعنی تمام افراد معاشرہ اور ان کی اولاد کے سامان زیست کی ذمہ داری۔۔ اسی کو ایتائے زکوٰۃ کہتے ہیں۔ یعنی نوع انسانی کو سامانِ نشوونما فراہم کرنا، اور، جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہے، یہ قرآنی مملکت کے قیام کا بنیادی مقصد ہے۔ ظاہر ہے کہ مملکت اتنی عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو نہیں سکتی جب تک رزق کی پیداوار کے ذرائع اس کی تحویل میں نہ ہوں۔ رزق کی پیداوار کا بنیادی ذریعہ، زمین ہے اور قرآن کی رو سے، زمین پر۔۔ جو خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ، انسانوں کی پرورش کے لئے عطا ہوئی ہے۔۔ انفرادی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔ اسے قرآن نے سواء للسائلین۔ (۴۱/۱۰) قرار دیا ہے۔ یعنی اسے تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہئے۔ کسی کی ملکیت میں نہیں چلے جانا چاہئے۔ اسی حقیقت کو نبی اکرم ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا۔ کہ:

زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے۔ اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہئے۔

اس سلسلہ میں آپ ﷺ نے پہلا اصلاحی قدم یہ اٹھایا کہ زمینداری کے نظام کو ختم کر کے یہ فیصلہ کر دیا کہ زمین کاشتکار کے پاس رہے گی اور وہ بھی اتنی جتنی وہ خود کاشت کر سکے۔ اس کے بعد، جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں عراق کی وسیع و عریض زمینیں مسلمانوں کے قبضے میں آئیں تو ان کی تقسیم کے سوال پر اچھی طرح بحث ہوئی اور بالآخر فیصلہ یہ ہوا کہ انہیں افراد میں تقسیم نہ کیا جائے بلکہ مملکت کی تحویل میں رکھا جائے۔ چنانچہ مملکت کی طرف سے اعلان کر دیا گیا کہ۔۔ لنا رقاب الارض۔۔ زمین مملکت کی رہے گی۔

ربوٰ کا مفہوم: زمین کی ملکیت یا تحویل کے بعد، سب سے اہم سوال، حصول دولت کا ہے۔ عصر حاضر میں معیشت کا یہ مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ معاوضہ محنت (Labour) کا ہونا چاہئے یا سرمایہ (Capital) کا اور جس انداز سے اس

سوال پر بحث ہوتی ہے اس سے ایسا نظر آتا ہے۔ گویا یہ سوال دنیا کے سامنے پہلی مرتبہ آیا ہے۔ حالانکہ ارباب فکر ونظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ قرآن کریم نے اس سوال کو مدت ہوئی حل کر کے رکھ دیا تھا۔ قرآن نے ربوٰ کو حرام قرار دیا ہے اور حرام بھی اس شدت کا کہ اس کے لئے کہا ہے کہ ایسا کرنا خدا اور رسول کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ ربوٰ کا ترجمہ ہمارے ہاں سود کیا جاتا ہے۔۔ اور اس ترجمہ کی بنا پر یہ بحثیں چل نکلی ہیں کہ تجارتی سود (Commercial Interest) اور بنکوں کا سود وغیرہ جائز ہے یا نہیں۔ آپ ذرا اس حقیقت پر غور کیجئے کہ قرآن نے 'ربوٰ کے علاوہ اور بھی بہت سی باتوں کو حرام قرار دیا ہے۔ لیکن ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو مجرم قرار دیا ہے۔ اس کے برعکس' ربوٰ کی یہ کیفیت ہے کہ اسے حرام قرار دیتے ہوئے کہا کہ: وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا (2:278) (ربوٰ میں سے جو کچھ کسی کے ذمے باقی ہے اسے چھوڑ دو اور اس کے بعد کہا کہ۔۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (2:279) اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اسے خدا اور رسول (اسلامی نظام) کے خلاف اعلان جنگ سمجھ لو۔ اس سے آپ دیکھئے کہ ربوٰ اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کے ارتکاب کو نظام مملکت کے خلاف اعلان جنگ قرار دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ربوٰ کے معنی ہیں ''سرمایہ پر بڑھوتی''۔۔ (سود تو اس کی صرف ایک شکل کا نام ہے) قرآن جس قسم کا نظام قائم کرنا چاہتا ہے اس میں سرمایہ کے معاوضہ کا اصول ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا' ربوٰ کا مرتکب' اسلامی مملکت کے اس نظام کے علی الرغم دوسرا نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مملکت کے نظام کے خلاف دوسرا نظام قائم کرنا کھلی ہوئی بغاوت ہے۔ اس لئے اسے ''خدا اور رسول کے خلاف اعلان جنگ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لہٰذا' قرآنی مملکت میں ایسا نظام جس میں سرمایہ کا معاوضہ لیا جائے' حرام ہی نہیں بلکہ مملکت کے خلاف بغاوت ہے اس میں معاوضہ صرف محنت کا ہوگا' سرمایہ کا نہیں ہوگا خواہ اس کی کوئی شکل ہو لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿۳۹﴾ (53:39) یعنی انسان صرف اس کا حقدار ہے جس کے لئے وہ محنت کرے۔ اس کے نظام کا بنیادی اصول ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ جب سرمایہ پر کچھ وصول ہی نہیں کیا جا سکے گا تو فاضلہ دولت (Surplus Money) کی' جو نظام سرمایہ داری کی اصل و بنیاد ہے' کوئی قیمت ہی نہیں رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ضرورت سے زیادہ سب کچھ دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دے دینے کا حکم دیا ہے۔ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (2:219) ''تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کے لئے کھلا رکھیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زیادہ ہے' سب کا سب۔'' اسی کی تفسیر رسول اللہ ﷺ کی وہ حدیث کرتی ہے جس میں حضرت بلالؓ نے کہا ہے کہ:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو رزق تجھے عطا کیا گیا ہے اسے چھپا کر نہ رکھو۔ اور اس میں سے جو کچھ تجھ سے مانگا جائے اسے مت روکو۔ میں نے کہا۔ یا رسول اللہ ﷺ! یہ کیسے ممکن ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یا تو ایسا کرنا ہوگا یا جہنم کا ایندھن بننا پڑے گا۔ (حاکم)

دولت کی تقسیم: کمیونزم کا سنگ بنیاد یہ اصول بتایا جاتا ہے:

From each according to his capacity's to each according to his needs.

یعنی ہر شخص سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جائے اور اس کی ضروریات کے مطابق اسے دیا جائے۔

اشتراکیت کا یہ اصول اس وقت تک محض ایک نظری اصول ہی ہے۔ اس پر عمل کہیں نہیں ہو رہا۔۔ جن ممالک کو اس وقت کمیونسٹ کہا جاتا ہے ان میں بھی کمیونزم کا نظام رائج نہیں' سوشلزم کا نظام رائج ہے۔ اس لئے ہنوز کمیونزم کا مندرجہ بالا اصول شرمندۂ معنی نہیں ہوا۔ لیکن اس اصول پر آج سے چودہ سو سال پہلے حجاز کی قرآنی مملکت میں عمل بھی ہو چکا ہے۔ اس میں شروع میں مالِ غنیمت کی تقسیم ہوتی تھی تو اس تقسیم میں رسول اللہ ﷺ کا دستور یہ تھا کہ آپ غیر شادی شدہ کو ایک حصہ دیتے تھے اور شادی شدہ کو دگنا حصہ' کیونکہ اس کی ضروریات زیادہ ہوتی تھیں۔ اس کے بعد جب افرادِ مملکت کے وظائف مقرر کر دیئے گئے تو ان میں بھی یہی اصول کارفرما رکھا گیا۔ یہ اس لئے کہ تمام افرادِ معاشرہ کو رزق۔۔ یعنی سامانِ زیست۔۔ مہیا کرنا اس مملکت کا فریضہ تھا۔ اس میں کوئی دوسرا اصول نافذ العمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس مملکت نے ایسا معاشرہ قائم کرنا تھا' جس میں کیفیت یہ ہو کہ: اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿١١٨﴾ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿١١٩﴾ (20:119-118) نہ کوئی شخص بھوک اور پیاس کی وجہ سے پریشان ہو اور نہ ہی وہ لباس اور مکان سے محروم رہے۔ یہ ہر فرد کی کم از کم بنیادی ضروریاتِ زندگی ہیں جن سے قرآنی مملکت میں کوئی بھی محروم نہیں رہ سکتا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس معاشرہ میں صرف انہی بنیادی ضروریات پر اکتفا کیا جاتا ہے اور دیگر سامانِ آسائش و زیبائش سے محرومی ہوتی ہے۔ جوں جوں اس معاشرہ میں ترقی ہوتی جاتی ہے اس کا نقشہ جنتی بنتا جاتا ہے جس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ: وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ (22:23) نہایت اعلیٰ درجہ کے ریشمی ملبوسات ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ (18:31) دبیز و لطیف ریشم کے زرکار پردے سورِ موضوفۃ مرصع اور نرم و نازک صوفے۔ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا (76:15) چاندی کے برتن اور بلوریں آبخورے۔ غرضیکہ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا (76:20) عظیم مملکت اور اس میں سامانِ آسائش نہایت فراواں۔ اور پھر یہ سامانِ آسائش و آرائش کسی خاص طبقہ کے لئے مخصوص نہیں ہوگا بلکہ ہر فردِ معاشرہ کے لئے یکساں۔ قرآن میں آپ شروع سے اخیر تک دیکھ جایئے۔ اس میں کہیں یہ نہیں لکھا ملے گا کہ جنتی زندگی کی یہ آسائشیں۔ ایک خاص طبقہ کے لئے ہوں گی اور عوام ان سے محروم رہیں گے۔ قرآنی مملکت کے جنتی معاشرہ میں یہ تمام سامان ہر ایک کو میسر ہوگا۔ اس میں سب کا معیارِ زندگی اتنا بلند ہوگا۔ جنت کا کوئی گوشہ جہنم نہیں ہو سکتا۔

دنیا میں آپ عام اخلاقی برائیوں پر غور کیجئے۔ ان کے اولین سرچشمے دو ہی نظر آئیں گے۔ یعنی افراطِ زر یا افلاس و نکبت۔ افراطِ زر سے سرکشی و طغیانی کے فساد انگیز معائب ظہور پذیر ہوتے ہیں۔۔ اور نکبت و افلاس سے پستی و دنائت کے انسانیت کش عیوب و ذمائم۔ جب قرآنی مملکت کے جنتی معاشرہ میں نہ افراطِ زر ہوگا نہ افلاس و زبوں حالی' تو ظاہر ہے کہ اس میں' ان سے پیدا ہونے والے عیوب و ذمائم کا بھی وجود نہیں ہوگا۔۔ حسد' کینہ' انتقام' تنگ نظری' حرص' ہوس' فریب کاریاں' مکاریاں' سازشیں۔۔ اور دوسری طرف بے حمیتی' بے غیرتی' ذلتِ نفس' تملق' خوشامد' منافقت وغیرہ' یہ سب عیوب معاشرتی

ناہمواریوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب یہ ناہمواریاں مٹ جائیں تو ان، وجۂ ننگِ انسانیت بدنہادیوں اور بدلگامیوں کا بھی وجود باقی نہیں رہتا۔ اس معاشرہ کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ: لَا یَسۡمَعُوۡنَ فِیۡہَا لَغۡوًا وَّ لَا تَاۡثِیۡمًا ﴿۲۵﴾ اس میں نہ لغویت اور بیہودہ پن ہوتا ہے، نہ کوئی ایسی حرکت جس سے کسی کے دل میں افسردگی و اضمحلال پیدا ہو۔ اِلَّا قِیۡلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴿۲۶﴾ (56:25-26) اس میں ہر طرف سے سلامتی کی نشید دلنواز و آہنگ جاں افروز سنائی دیتی ہے۔ وَ نَزَعۡنَا مَا فِیۡ صُدُوۡرِہِمۡ مِّنۡ غِلٍّ (7:43) ان کے سینے تمام ایسی کثافتوں سے پاک وصاف ہوں گے جنہیں انسان، غلط معاشرہ میں، دل میں چھپائے رکھتا ہے۔ اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہوگی جسے ایک دوسرے سے چھپانے کی ضرورت پڑے۔ تکریم انسانیت اور احترامِ آدمیت وہاں کا عام اندازِ نگاہ ہوگا۔ وہاں نہ کوئی کسی کو ذلیل سمجھے گا نہ ذلیل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس معاشرہ کا انداز وہ ہوگا جس کا نقشہ اقبالؔ نے (جاوید نامہ میں) ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ ؎

ساکنانش در سخن شیریں چونوش — خوبروئے و نرم خوئے و سادہ پوش
فکرِ شاں بے درد و سوزِ اکتساب — راز دانِ کیمیائے آفتاب
کس ز دینار و درم آگاہ نیست — ایں بُتاں را در حرمہا راہ نیست
خدمت آمد مقصدِ علم و ہنر — کارہا را کس نمی سنجد بزر
سخت کش دہقاں چراغش روشن است — از نہابِ دہ خدایاں ایمن است
کِشت و کارش بے نزاعِ آبجو! — حاصلش بے شرکتِ غیرے ازو!!
اندراں عالم نہ لشکر نے قشوں — نے کسے روزی خورد از کشت و خوں
نے قلم در مَرغدیں گیرد فروغ — از فنِ تحریر و تشہیر و دروغ
نے ببازاراں ز بے کاراں خروش! — نے صداہائے گدایاں دردِ گوش!

''ترجمہ: ۞ اس کے رہنے والے شیریں گفتار ایسے جیسے ان کی باتیں شربت کی طرح میٹھی ہوں۔ وہ لوگ حسین وجمیل، نرم خصلت والے اور سادہ لباس پہننے والے تھے/ ہیں۔ ۞ ان کی سوچ حصولِ اشیاء کے سلسلے میں کسی دکھ درد کی حامل نہیں۔ وہ سورج کے کیمیاء کے رازوں سے واقف ہیں۔ ۞ یہاں کوئی شخص دینار اور درہم (کرنسی کے نظام) سے واقف نہیں ہے۔ وہاں کے حرم (کعبہ) میں ان بتوں (دینار و درہم) کا کوئی دخل نہیں ہے۔ ۞ یہاں علم و ہنر کا مقصد دوسروں کی خدمت کرنا ہے۔ لوگ کام کو زر (دولت) میں نہیں تولتے۔ ۞ یہاں کا کسان جفاکش ہے اور اس کے گھر میں چراغ روشن ہے۔ وہ زمینداروں کی لوٹ گھسوٹ اور ان کے ظلم سے محفوظ ہے۔ ۞ ان کی کاشتکاری میں ندی کے پانی کے جھگڑے نہیں ہوتے اور فصل کسی کی شرکت کے بغیر اس کی اپنی ہے۔ پیداوار میں کوئی اور حصے دار نہیں۔ ۞ اس جہان میں تو کوئی لشکر ہے اور نہ کوئی فوج ہے اور نہ یہاں کوئی دوسروں کا خون بہا کر روزی کماتا ہے۔ ۞ مرغدین میں فنِ تحریر اور جھوٹی اشتہار بازی کی خاطر قلم کو کوئی فروغ حاصل نہیں ہے۔ ۞ نہ تو یہاں کے بازاروں میں بے کاروں کی نعرہ بازی ہے اور نہ بھیک مانگنے والوں کی کانوں کو دکھ پہنچانے والی آوازیں ہیں۔

آخر میں اقبالؔ نے اس تمام تفصیل کو ایک شعر میں اس طرح سمٹا دیا ہے کہ اس کے بعد اس سلسلہ میں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یعنی قرآنی مملکت وہ ہے کہ ؎

کس در آں جا سائل و محروم نیست　　عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ (21:92) اوپر ایک خدا جس کی اطاعت کا قلاوہ زیب گلو اور نیچے ساری امت ایک صف میں دوش بدوش ایستادہ۔۔ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:78) اس میں کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا خواہ اسے ضابطۂ قوانین اور حکومت' حتیٰ کہ نبوت بھی کیوں نہ مل جائے کہ وہ لوگوں کو اپنا محکوم بنائے اور ظاہر ہے کہ کسی کو محکوم بنانے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اسے محتاج بنا دیا جائے۔ جب قرآنی مملکت میں کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوگا تو وہ کسی کا محکوم کس طرح سے ہوگا۔

اس قرآنی معاشرہ کی تشکیل کی ابتداء' خود اربابِ نظم ونسق کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا یہ قول' قول فیصل کا حکم رکھتا ہے کہ:

اگر میں پیٹ بھر کر کھڑا ہو جاؤں اور دیگر افرادِ معاشرہ بھوکے ہوں تو اس کے ایک ہی معنی ہیں کہ میں عوام کا اچھا رکھوالا نہیں ہوں۔۔ خدا کی قسم! اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا مر جائے تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔

اور حضور نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی کہ:

جس بستی میں کسی ایک شخص نے بھی رات بھوکے بسر کی تو اس بستی سے خدا کی حفاظت کا ذمہ ختم ہو جاتا ہے۔

اسی لئے قرآنی مملکت کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ اگر کسی بستی میں کوئی شخص بھوک سے مر جائے تو اس بستی کے باشندوں کو اس کا قاتل سمجھا جاتا ہے اور ان سے اس کا خون بہا وصول کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ قرآنی مملکت کا یہ نظام اسی صورت میں قائم رہ سکتا اور بہ حسن وخوبی چل سکتا ہے' جب اس کے عُمال (کارندے) دیانتدار اور قابل ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ بار بار اس قسم کی تاکیدی ہدایات جاری کرتے رہتے تھے کہ:

یاد رکھو! جس شخص کے سپرد اُمت کا کوئی اقتدار ہوا اور پھر اس نے قابلیت کے بجائے اپنی محبت یا قرابت کی بنا پر کسی کو مسلمانوں کا حاکم بنا دیا' تو اس نے اللہ' اور اس کے رسول ﷺ اور مسلمانوں سے غداری کی۔

اس باب میں ان کی احتیاط کا کیا عالم تھا' اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایئے کہ انہیں ولایتِ کوفہ کے لئے ایک خاص ٹائپ کے کارکن کی ضرورت تھی' جو بسیار کوشش کے باوجود مل نہیں رہا تھا۔ ایک شخص نے ان سے کہا کہ میں ایک ایسے آدمی کو جانتا ہوں جو ان خوبیوں کا مالک ہے۔ آپ اسے منتخب کر لیں۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ اس نے کہا کہ آپ کا بیٹا۔۔ عبداللہ۔۔ یہ سن کر انہوں نے کہا کہ قاتلک اللہ۔ خدا تجھے غارت کرے۔ تو مجھے یہ کس قسم کا مشورہ دے رہا ہے؟ عبداللہ ابن عمرؓ بے شک ان خوبیوں کے مالک تھے لیکن حضرت عمرؓ کو اس کا احساس تھا کہ اگر اس کی طرح پڑ گئی تو اس کا انجام

کس قدر تباہ کن ہوگا۔ مملکت کے مناصب‘ اربابِ اقتدار کے اعزہ واقارب میں بٹنے لگ جائیں گے۔ وہ عمالِ حکومت کو تاکیداً لکھتے رہتے تھے کہ:

سخت کوشی کی زندگی بسر کرنے کے عادی بنو۔ موٹا جھوٹا کھاؤ‘ گاڑھا گزی پہنو‘ پرانے کپڑے استعمال کرو‘ سواریوں کو خوب چارہ دو‘ ڈٹ کر گھوڑے کی سواری کرو اور جم کر تیر اندازی کرو۔

حقیقت یہ ہے‘ کہ تاریخ میں جو ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں حکومت کا کوئی کارندہ بددیانت اور رشوت خور نہیں تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس قسم کے معاشی نظام میں کسی کو بددیانت بننے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ بددیانتی اور رشوت خوری کی ابتداء تو اس سے ہوتی ہے کہ حکومت کے ملازمین کو اپنے مستقبل کے متعلق ہمیشہ دھڑ کا لگا رہتا ہی۔ یہ عدم تحفظ (Insecurity) کا احساس اور خدشہ ہے جو انہیں زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ اس کی ابتدا تو اس سے ہوتی ہے اور اس کے بعد‘ زراندوزی کی ہوس انہیں آگے ہی آگے لئے چلی جاتی ہے۔ قرآنی مملکت کے نظام میں عدم تحفظ کا خیال تک نہیں پیدا ہو سکتا۔ اس میں‘ تمام افرادِ مملکت اور ان کے بچوں کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے۔ اس لئے کسی کو اس کی فکر ہی نہیں ہوتی‘ کہ کل کو میرا یا میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا اور نہ ہی اس میں جائیدادیں کھڑی کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا‘ اس نظام میں کوئی شخص بددیانت ہو نہیں سکتا۔ اسے بددیانت ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

محیر العقول کارنامے: اگلے دنوں میرے ایک فوجی دوست نے مجھ سے پوچھا کہ قرنِ اول میں مسلمان سپاہیوں (مجاہدین) نے جو محیر العقول کارنامے کر دکھائے‘ اس کی بنیادی وجہ کیا تھی؟ میں نے کہا کہ ذرا اس پر غور کیجئے کہ وہ کون سے اسباب واحساسات ہیں جن کی وجہ سے ایک سپاہی میدانِ جنگ سے بھاگ جاتا یا کمزوری دکھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسمیں پہلا احساس یہ ہوتا ہے کہ میں مر جاؤں گا اور دوسرا احساس یہ کہ میرے بعد میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا؟ وہ تباہ ہو جائیں گے۔ قرآن نے یہ تصور دیا کہ موت صرف نقلِ مکانی کا نام ہے۔ کوئی انسان موت سے ختم نہیں ہو جاتا۔ وہ زندہ رہتا ہے۔ بس صرف مکان کی تبدیلی ہوتی ہے۔ (اسی لئے ہمارے ہاں موت کے لئے انتقال کا لفظ رائج تھا جو اس تصور کی ٹھیک ترجمانی کرتا تھا)۔۔ مسلمان سپاہی کے دل میں یہ تصور‘ ایمان کی حیثیت لئے ہوتا ہے۔ اس لئے اسے موت کا ڈر ہی نہیں ہوتا۔ باقی رہا یہ دھڑکا کہ میرے مرنے کے بعد میرے بیوی بچوں کا کیا ہوگا‘ تو اس کی ذمہ داری پہلے ہی سے مملکت نے لے رکھی ہوتی ہے۔ لہٰذا‘ اسے یہ غم بھی نہیں ستاتا۔ اب سوچئے کہ جس سپاہی کو نہ موت کا ڈر ہو۔ اور نہ ہی اپنے پسماندگان کے مستقبل کی طرف سے کسی قسم کا تردد‘ اس کے زورِ بازو کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ اس کی تو نگاہ سے (اقبالؒ کے الفاظ میں) تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اگر روٹی کی فکر سے آزاد کر دیا جائے‘ تو وہ جن بن جاتا ہے۔ اس کی وہ صلاحیتیں جو اس سے پہلے‘ چکی کے اس پاٹ۔۔ (Mill-Stone) کے نیچے بری طرح سے دبی اور کچلی رہتی ہیں‘ اس طرح ابھر کر باہر آتی ہیں‘ کہ وہ کچھ اور کی اور مخلوق بن جاتا ہے۔ وہ صحیح انسانی پیکر میں سامنے آتا ہے۔ اس کی عظمتِ انسانیت چھلک کر باہر آ جاتی ہے۔ اس کی ممکناتِ زندگی ایک ایک کر کے‘ محسوس پیکر اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ‘ وہ کچھ کر کے دکھا دیتا ہے جسے عام سطح کا انسان‘

معجزات اور کرامات سمجھتا ہے۔ حالانکہ وہ نہ کوئی معجزہ ہوتا ہے نہ کرامت۔ روٹی کے چکر میں پھنسا ہوا انسان، کبھی انسانی سطح پر آ نہیں سکتا۔ اسے کسی انسانی مسئلہ کی طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے جو قرآن کریم نے حضرات انبیاء علیہم السلام سے کہا کہ:

(مفہوم) اے ہمارے رسولو! خوش گوار رزق کھاؤ اور اعمال صالح کرو (23:51)۔

آپ نے غور فرمایا کہ اعمالِ صالح اور روٹی کا کس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے۔ میں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ یہ جو ہمارے ہاں ایک مذہبی افسانہ مشہور ہے کہ ابلیس نے آدم کو دانۂ گندم کھلا دیا جس سے وہ جنت سے باہر نکال دیا گیا، تو اس سے کسی سیانے نے اسی طرف اشارہ تو نہیں کیا کہ انسان کو جنت سے نکلوانا مقصود ہو تو اسے روٹی کی فکر میں الجھا دو۔ اس کی تائید خود قرآن سے بھی ہوتی ہے۔ اس نے قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں بتایا ہے کہ آدم جس جنت میں رہتا تھا، وہاں اسے روٹی کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہاں اس کی کیفیت یہ تھی کہ: وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (2:35) وہ جہاں سے جی چاہتا، پیٹ بھر کر کھا لیتا۔ اس سے کہا گیا کہ یاد رکھو! اگر تم ابلیس کے فریب میں آ گئے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ: يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى (20:117) وہ تمہیں اس جنتی زندگی سے نکلوا دے گا اور تمہیں اسی روٹی کی خاطر جگر پاش مشقتیں اٹھانی پڑیں گی۔ انسان اس کے فریب میں آ گیا، جس کا نتیجہ سرمایہ دارانہ نظام کی انفرادیت تھی۔ اس سے بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (20:122) کی انسانیت سوز جہنم وجود میں آ گئی۔ جس میں ہر فرد کا مفاد دوسرے فرد کے مفاد سے ٹکرانے لگا۔ انسان کو اس جہنم سے نکالنے کے لئے، آسمانی راہنمائی کا سلسلہ شروع ہوا۔

بعثتِ نبی اکرم ﷺ کا مقصد: قرآن کریم نے نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا ہے کہ: وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (7:157) یہ ان زنجیروں کو توڑ ڈالے گا، جن میں انسانیت جکڑی ہوئی تھی، اور اس کے سر سے ان سلوں کو اتار پھینکے گا جن کے نیچے وہ بری طرح دبی ہوئی تھی۔ ان زنجیروں میں سب سے زیادہ کڑی اور ان سلوں میں سب سے زیادہ بوجھل، وہ خوف و ہراس تھا جو ''روحانی قوتوں'' کے نام سے انسان کے اعصاب پر سوار چلا آ رہا تھا۔ اس سے اس میں جس قسم کی نفسیاتی الجھنیں (Complexes) پیدا ہوتی تھیں، ہماری علمی دنیا اب ان سے اچھی طرح روشناس ہو چکی ہے۔ قرآن کریم نے ختم نبوت کے اعلان سے اس سارے بوجھ کو الگ کر کے رکھ دیا۔ اس نے کہا کہ اب کوئی انسان کسی دوسرے انسان سے آ کر یہ نہیں کہہ سکے گا کہ میں آسمان سے آیا ہوں اور تم زمینی مخلوق ہو۔ خود نبی اکرم ﷺ نے یہ کہہ کر کہ: اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (18:110) اس باب میں سبقت کی۔

اب کوئی مافوق الفطرت عنصر، یا جسے عام طور پر روحانی قوت کہا جاتا ہے، انسانی زندگی پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ اس سے انسانی صلاحیتوں کو ابھرنے اور نشوونما پانے کا کلی امکان حاصل ہو گیا۔ اور انسان کو پرکھنے کا معیار، شرف انسانیت (یعنی اس کی انسانی صلاحیتوں کی سطح) قرار پا گیا۔ اس حقیقت کو قرآنی معاشرہ کے ارباب فکر و عمل کیسے اچھی طرح سمجھے ہوئے تھے، اس کا اندازہ حضرت عمرؓ کے پیش کردہ اس معیار سے لگایئے جو ہمیں تاریخ کے صفحات میں محفوظ ملتا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ

ایک بار کوئی شخص آپ کے سامنے کسی مقدمہ میں پیش ہوا۔ آپ نے اس سے کہا کہ تم کسی ایسے آدمی کو لاؤ جو تمہیں اچھی طرح جانتا ہو۔ وہ ایک آدمی کو لایا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ کیا تم اس شخص کو اچھی طرح جانتے ہو۔ اس نے ہاں کہا تو آپ نے پوچھا کہ کیا تم کبھی اس کے پڑوس میں رہے ہو؟ اور اس کی اندر باہر کی زندگی سے واقف ہو۔ اس نے نفی میں جواب دیا' تو آپ نے کہا کہ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے' اس کا جواب بھی نفی میں ملا۔ تو آپ نے کہا کہ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ لین دین کا معاملہ کیا ہے؟ اس نے اس سے بھی انکار کیا۔ تو حضرت عمرؓ نے جو کچھ فرمایا وہ اس نکتہ کی اچھی طرح حقیقت کشائی کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ:

پھر یوں نظر آتا ہے کہ تم نے اسے مسجد میں کھڑے قرآن پڑھتے' کبھی سر جھکاتے اور سر اوپر اٹھاتے ہی دیکھا ہے۔

اس نے اقرار کیا تو آپ نے کہا کہ ''چلے جاؤ۔ تم اسے خاک نہیں جانتے۔'' اور اس شخص سے کہا کہ تم کسی ایسے آدمی کو لاؤ جو تمہیں انسان کی حیثیت سے جانتا ہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم کی عطا فرمودہ نئی اقدار' اور نبی اکرم ﷺ کے عدیم المثال عمل نے' انسانیت کے ماپنے کے کس قدر نئے پیمانے عطا کر دیئے تھے۔ یہ وہ پیمانے تھے جن کی رو سے انسان کی قدر و قیمت اس کی انسانی صلاحیتوں کی بنا پر متعین ہوتی تھی اور ان صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقعہ ان اقدار کی رو سے ملتا تھا۔

نہ خوف نہ حزن: وہ دوسری سلیں جنہوں نے انسان کو بری طرح کچل رکھا تھا' چکی کے پاٹ تھے یعنی روٹی کی فکر۔۔ قرآنی مملکت نے انسان کو اس فکر سے آزاد کر کے' اس محبوس قفس طائر لاہوتی کو آزادی کی حقیقی فضاؤں میں اذن بال کشائی دے دیا جس سے اسے اپنی منزل آسمانوں میں نظر آنے لگی۔ قرآن کریم نے قرآنی مملکت کی خصوصیت کبریٰ یہ بتائی ہے کہ اس میں افراد معاشرہ کی کیفیت یہ ہوگی کہ:

لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (10:62) ان پر نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔۔ یعنی وہ ہر قسم کے خوف اور حزن سے مامون ہوں گے۔ خوف کے معنی تو ہم سمجھتے ہیں۔۔ کسی آنے والے خطرہ کے احساس سے ہراساں۔۔ قرآنی مملکت میں کس قدر بے خوفی اور امن ہوتا ہے' اس کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں ایسا نظام قائم کروں گا' جس میں حالت یہ ہوگی کہ یمن سے ایک عورت تنہا' صحراؤں اور بیابانوں سے سفر کرتی ہوئی شام تک چلی جائے گی' اور اسے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا۔ بے خوفی اور امن کے ماپنے کا اس سے بہتر پیمانہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ باقی رہا وہ خوف جو زیردستوں کو بالادستوں کی طرف سے ہر وقت وجہ سوہانِ روح بنا رہتا ہے' سو اس کے متعلق وہ واقعہ سامنے لایئے کہ حضرت عمرؓ ایک دفعہ ایک وادی میں سے گزر رہے تھے کہ آپؓ نے یکا یک سواری کو روکا۔ نیچے اترے اور سجدے میں گر گئے۔ رفقاء نے پوچھا کہ آپ نے یہ کیا کیا تو فرمایا کہ یہ وہ وادی ہے جس میں عمرؓ اپنے باپ کے اونٹ چرایا کرتا تھا اور سہمے سہمے پھرا کرتا تھا۔ باپ بھی سخت تھا اور یونہی بات بات پر پیٹ دیا کرتا تھا۔ ایک وہ دن تھا' اور ایک یہ دن ہے کہ عمر اور اس کی خدا کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں جس سے ڈرا جائے۔ یہ وادی دیکھ کر مجھے یہ احساس اس شدت سے ہوا کہ میں بے اختیار بحضور

رب العزت سجدہ میں گر گیا۔

یہ ہوتا ہے' قرآنی مملکت میں بے خوفی کا عالم۔ اس میں' خدا اور بندے کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں ہوتی جس سے ڈرا جائے۔ اور خدا کا ڈر بھی کسی مستبد حاکم کا ڈر نہیں ہوتا۔ خدا کے ڈر سے مراد ہوتا ہے اس نقصان اور تباہی کا احساس' جو قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ مثلاً جس طرح ہم دریا کے کنارے چلتے ہوئے' پاؤں پھسلنے کے انجام سے ڈرتے ہیں۔۔ قرآنی مملکت میں قانون شکنی کے نقصان رساں نتائج کے احساس کے علاوہ اور کسی قسم کا خوف کسی کو نہیں ستاتا۔

باقی رہا حزن' تو یہ لفظ بڑے گہرے معانی کا حامل ہے۔ عام طور پر اس کے معنی افسردگی اور اندوہ ناکی ہوتے ہیں خواہ اس کی وجہ کچھ بھی ہو۔ لیکن اسے بالخصوص اس افسردگی اور غمگینی کے لئے بولا جاتا ہے جو معاشی پریشانی کی وجہ سے حائل ہو۔ سورۂ فاطر میں جنتی معاشرہ میں بسنے والوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کی زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ آئیں گے کہ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ کس قدر قابل حمد و ستائش خدا (کا وہ نظام) جس نے ہمیں حزن سے نجات دلائی۔ عربی زبان کے مستند لغت' تاج العروس میں لکھا ہے کہ یہاں حزن کے معنی ہیں صبح و شام کے کھانے کی فکر۔۔ اس کی تشریح خود اگلی آیت نے کر دی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ: الَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ (35-34:35) وہ خدا جس نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں ایسا معاشرہ عطا کر دیا ہے جس میں نہ کوئی جگر پاش مشقت ہے' نہ ذہنی کاوش و نفسیاتی افسردگی' نہ اس میں روٹی کے لئے مارے مارے پھرنا پڑتا ہے اور نہ ہی باہمی معاملات میں اس قسم کا الجھاؤ پیدا ہوتا ہے جس سے انسان خواہ مخواہ پریشان رہے۔۔ فکر معاش کی طرف سے آسودگی اور باہمی خوش معاملگی' یہ ہیں قرآنی مملکت کی بنیادی برکات و حسنات۔

قرآن کریم (میں سورۂ فاتحہ) کی ابتداء اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ سے ہوتی ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا درخور حمد و ستائش اس لئے ہے کہ وہ کائنات کی نشو و نما کرتا ہے اور قرآن کی آخری سورت میں اسے رب الناس کہا گیا ہے۔ یعنی پوری نوع انسانی کو سامان نشو و نما بہم پہنچانے والا۔۔ جیسا کہ شروع میں بتایا جا چکا ہے' انسانی دنیا میں خدا کی یہ ذمہ داری اس مملکت کے ذریعے پوری ہوتی ہے جو اس کے نام سے قائم کی جاتی ہے۔ یہ مملکت بھی اسی لئے مستحق حمد و ستائش ہوتی ہے کہ یہ افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی مہیا کرتی ہے اور ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما کا انتظام کرتی ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو قطعاً مستحق تعریف و توصیف قرار نہیں پا سکتی۔ یہ وجہ ہے کہ قرآنی مملکت کے ارباب بست و کشاد ہمیشہ اس فریضہ کی ادائیگی میں مصروف تگ و تاز رہتے ہیں۔ وہ سزاوار حمد و ستائش قرار ہی اس وقت پاتے ہیں جب وہ یہ کچھ کر کے دکھائیں۔ ان کے برعکس' دوسرے ارباب اقتدار کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ: يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا (3:187) ان کی ہر وقت یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کی تعریف ان کاموں کی بنا پر کی جائے جنہیں وہ سرانجام نہیں دیتے۔ قرآنی مملکت میں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس میں یہ لوگ سب کچھ کر کے بھی کسی صلہ کی توقع یا ستائش کی تمنا نہیں رکھتے۔ اگر کوئی بے ساختہ ان کا سپاس گذار ہونا بھی چاہتا ہے' تو وہ اس سے کہہ دیتے ہیں کہ: لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (76:9) ہم تم سے کسی معاوضہ کے تو ایک

طرف، شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں ہیں۔

ہمارے ہاں بدقسمتی سے ''امام مہدی'' کا صحیح مفہوم نظریاتی بحثوں اور معتقداتی پیچیدگیوں میں کھو کر رہ گیا، ورنہ (اگر وہ روایات صحیح ہیں تو) نبی اکرم ﷺ نے، ان میں صحیح قرآنی نظام کے سربراہ کی خصوصیات کی طرف اشارہ فرمایا تھا، نہ کہ کسی مافوق الفطرت راستے سے آنے والی منفرد شخصیت کی منفرد خصوصیات۔ آپ نے اس سربراہ مملکت اسلامیہ کی نمایاں خصوصیت یہ بتائی تھی کہ: یقسم المال صحیحاً وہ مال کی صحیح صحیح تقسیم کرے گا۔ کسی نے پوچھا کہ مال کی صحیح تقسیم کا معیار کیا ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ: بالسویۃ بین الناس تسویہ کے معنی ہوتے ہیں، کسی شے میں ہر قوت کا صحیح صحیح تناسب کے ساتھ موجود ہونا اور اس طرح اس کا اپنی انتہائی نشوونما تک پہنچ جانا۔ السوی اس چیز کو کہا جاتا ہے جو ہر اعتبار سے افراط و تفریط سے محفوظ ہو اور ٹھیک ٹھیک تناسب رکھتی ہو۔ استوی الرجل۔۔ کے معنی ہیں، اس شخص کا شباب اپنے انتہا تک پہنچ گیا۔ لہٰذا مال کی تقسیم تسویۃً کے معنی یہ ہوں گے کہ معاشرہ میں سرمایہ کی تقسیم اس طرح ہو کہ نہ اس میں افراط ہو نہ تفریط بلکہ اس انداز سے کہ ہر شخص کی صحیح صحیح نشوونما ہو سکے اور اس کی صلاحیتیں بھرپور شباب تک پہنچ جائیں۔

قرآنی مملکت کی خصوصیات کی تفصیل اتنی طویل ہے کہ اسے ایک نشست میں ختم نہیں کیا جا سکتا اس لئے میں آخر میں حضرت عمرؓ کے اس قول کو پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں جو میرے نزدیک اس باب میں حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم میں سے جب بھی کسی شخص کو کوئی شکایت ہوتی ہے تو وہ کسی ایسے دروازے کو تلاش کرتا ہے جس پر دستک دینے سے اس کی شکایت رفع ہو سکے اور جب وہ دنیا کے تمام دروازوں کو بند پاتا ہے تو مجبور ہو کر اپنے خدا سے فریاد کرتا ہے۔ اسے دعا کہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ایک خطبہ عام میں کہا تھا کہ:

لوگو! مجھے اللہ نے اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو اس تک پہنچنے سے روک دوں۔

یعنی ایسا انتظام کر دوں کہ اول تو تمہیں کسی بات کے لئے خدا کے ہاں فریاد کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے اور اگر کبھی ایسا ہو جائے تو قبل اس کے کہ تمہاری شکایت خدا تک پہنچے، اس کا ازالہ ہو چکا ہو۔ یہ ہے قرآنی مملکت کی بنیادی خصوصیت اور یہی وہ امامتِ کبریٰ ہے جس کے حصول کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ امامت اس لئے کہ اس قسم کی مملکت کا وجود دنیا میں کہیں نہیں تھا۔ اس لئے پاکستان کی تشکیل سے یہ سبقت و امامت اسی کے حصہ میں آنی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان کا تصور دینے والے (اقبالؒ) نے، یہ تصور دیتے ہوئے کہا تھا کہ ؎

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد　　　مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

قرآنی پاکستان، اسی عالم افروز اور انسانیت ساز تصور کا حسین و جمیل پیکر ہوتا۔۔ لیکن

اور یہ ''لیکن'' ایک داستان ہے جگر گداز، اور ایک حدیث ہے دلخراش۔۔ اگر میں نے اسے بیان کرنا شروع کر دیا تو مجھے ڈر ہے کہ آپ یہ نہ کہہ دیں کہ ؎

پھر چھیڑا حسنؔ نے اپنا قصہ　　　لو آج کی شب بھی سو چکے ہم

اس لئے میں اس خواب رُبا قصہ کی تفصیل میں جانے کے بجائے' اسے قرآن کے الفاظ میں کیوں نہ پیش کردوں جن میں اختصار اور جامعیت معجزانہ حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ آپ سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۱۷۵ سامنے لائیے جہاں سے بات کا آغاز اس طرح کیا گیا ہے کہ:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا (7:175)

تم انہیں اس شخص کی عبرت آمیز داستان (تمثیلاً) سناؤ جسے ہم نے منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے تمام نشانات راہ عطا کر دیئے تھے۔ لیکن وہ انہیں چھوڑ کر یوں الگ ہوگیا جیسے سانپ اپنی کینچلی سے نکل جاتا ہے کہ اس پر اس کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہتا۔ ایسا اس لئے ہوا کہ وہ اپنے ذاتی مفادات کے حصول اور پست جذبات کی تسکین کے پیچھے لگ گیا اور یوں راہ سے بے راہ رو ہوگیا۔

ہم چاہتے تھے کہ وہ آسمان کی بلندیوں تک پہنچ جائے لیکن وہ زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک کر رہ گیا۔ انفرادی مفاد پرستیوں کا نتیجہ یہی ہوا کرتا ہے۔ ان ہولنا کیوں سے اسکی مثال کتے کی سی ہوگئی کہ اسے اکساؤ اور دوڑاؤ' تو بھی وہ ہانپے اور زبان لٹکائے اور ویسے چھوڑ دو تو بھی ہانپے اور زبان لٹکائے۔ اس کا ہونکنا کسی صورت میں کم ہی نہ ہو۔

ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ (7:176) یہ حالت ہوجاتی ہے اس قوم کی جو ہمارے قوانین (کا زبانی اقرار تو کرتی ہے لیکن عملاً انہیں) جھٹلاتی ہے۔ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (7:176) تم انہیں ان کی یہ داستان سناؤ' شاید یہ اس پر غور وفکر کریں اور سوچیں کہ ہمیں کیا ہوگیا۔ سَآءَ مَثَلًا الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا (7:177) اف! کس قدر بری حالت ہوجاتی ہے اس قوم کی جو ہمارے قوانین کی عملاً تکذیب کرتی ہے۔ اس میں ہر ظلم و زیادتی کرنے والا سمجھتا ہے کہ میں دوسروں کو لوٹ کر اپنا فائدہ کر رہا ہوں۔ لیکن نہیں سوچتا کہ: وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ (7:177) وہ اس طرح کسی دوسرے کا نہیں' خود اپنا ہی نقصان کر رہا ہے۔۔ جذبات پرستی کے طوفان میں غرق ہونے سے ان کی حالت یہ ہوجاتی ہے کہ:

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ (7:179) وہ سینے میں دل رکھتے ہیں لیکن ان سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ (7:179) وہ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ (7:179) ان کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن انہیں کچھ سنائی نہیں دیتا۔ اُولٰۗىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ (7:179)۔ تم انہیں انسان سمجھتے ہو؟ نہیں۔۔ یہ انسان نہیں' حیوان ہیں بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ (7:179) نہیں! یہ تو ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (7:179) حیوان اپنی زندگی کے تقاضوں سے کبھی غافل نہیں ہوتا' اور ان انسان نما حیوانوں کو خبر ہی نہیں کہ ان کی زندگی کے تقاضے کیا ہیں اور یہ کس طرف جا رہے ہیں۔

مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں | کارواں تھک کر فضا کے پیچ وخم میں رہ گیا

امجد محمود، راولپنڈی

لطافت تمام شُد

بچہ پیدا ہوتا ہے تو والدین کو فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ اس کا نام کیا تجویز کیا جائے چند دنوں میں ہی آپس میں صلاح ومشورہ کرنے کے بعد کوئی نام رکھ دیا جاتا ہے جو اُس بچے کی پہچان بن جاتا ہے نام عام ہو یا کوئی خاص رکھتے وقت یہ معلوم نہیں ہوتا کہ بچہ بڑا ہو کر اپنے نام کے بہ وصف اور بہ معنی شخصیت بھی بن پائے گا!۔۔۔ خواہش تو ہو سکتی ہے لیکن یقینی طور پر کچھ معلوم نہیں ہو سکتا۔ شریف بدمعاش بن جاتا ہے اور نیک دل بڑا بد دل اور سفاک وغیرہ وغیرہ۔

یہ تو حسنِ اتفاق ہی جانیئے کہ کچھ ناموں کا بھرم اُن نام والوں کی سوچ اور شخصیت وکردار میں بھی اُبھر آتا ہے۔ یعنی اگر یُوں کہیے تو بے جا نہ ہوگا کہ ''ناموں کی معنویت میں گندھی ہوئی شخصیات''۔

ایک نام ہے لطیف دیکھئے یہ کیسا حسین معجزہ ہے کہ نام لطیف پایا اور اپنے نام کی مناسبت سے شخصیت بھی لطیف یعنی پُر لطف۔ والدین نے نام منتخب کرتے وقت کوئی ایسی آرزو کی تھی یا نہیں ہمیں نہیں معلوم۔ لیکن جو شخصیت بن اور اُبھر کر دُنیا کے سامنے آئی اُسے تو ہم نے بھی برسوں دیکھا اور سُنا۔ کئی طرح سے جائزہ لیا یقیناً لطیف کو ہمیشہ پُر لطائف ہی پایا۔ جب بھی کسی محفل میں گفتگو کا موقعہ ملا اُنہوں نے اپنے لطیفہ گوئی کے انداز میں ساری محفل کو گویا اپنا گرویدہ بنالیا۔ بات کو اپنی مخصوص ٹھیٹھ پنجابی زبان میں کچھ اِس طرح واضح کرتے تھے کہ دوسرے کو بات اچھی طرح سمجھ بھی آجائے اور اگر کوئی ہنسنا نہ بھی چاہے تو بھی وہ ہنسے اور ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جائے۔ الفاظ کا چناؤ بہت زبردست اور محتاط، دھیما لہجہ، طرزِ گفتگو شاندار، پوچھے گئے سوال کی مناسبت سے کوئی نہ کوئی پنجابی لطیفہ حاضر۔ دیہاتی پس منظر کی وجہ سے ایسا کھلا ڈھلا اور لاثانی انداز گویائی کہ بس کچھ نہ پوچھیئے فریفتہ ہو ہو جائے انسان۔ ادارہ میں جب موجود ہوتے تھے تو گویا ادارہ سارا ایک کشتِ زعفران کا سماں پیش کرتا تھا۔ مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک، بھاری بھرکم شخصیت کے حامل، سامع اُن کے سامنے بیٹھ کر ذہنی آسودگی اور قلبی راحت محسوس کرتا اور کبھی تنگ نہ ہوتا۔ خود کو کبھی بڑا اور اعلیٰ محسوس نہ کرتے تھے برعکس اس کے دیکھنے اور سُننے والے ہمیشہ اُنہیں ایک بڑا انسان گردانتے تھے۔ اے کاش موت کا آہنی ہاتھ اُن کی طرف نہ بڑھتا مگر کیا کیا جائے کہ ایک نہ ایک دن تو یہ ہو کر ہی رہتا ہے۔

چوہدری لطیف (سابق ناظم ادارہ) اپنی تمام تر لطافتوں کے ساتھ تمام شُد! دعا ہے اللہ پاک اُن کی مغفرت فرمائے اُن کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے اور لواحقین ودیگر کو صبر دائمی سے نوازے (آمین ثم آمین)

ادارہ طلوعِ اسلام اور بزم راولپنڈی کے محترم احباب اُن کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

پرویزؒ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مشینی انسان اور قرآنی نظام

یہ واقعہ ہے مملکتِ خداداد پاکستان کے دارالسلطنت' اسلام آباد کا' جسے احمد بشیر صاحب نے ڈوبتے ہوئے دل' کانپتے ہوئے ہاتھوں اور بھیگی ہوئی پلکوں کے ساتھ لکھا اور روزنامہ دی مسلم کی اشاعت بابت 24 اپریل 1981ء میں شائع ہوا اس کارواں ترجمہ ملخصاً درج ذیل کیا جاتا ہے' متعلقہ نام احتیاطاً حذف کرتے ہوئے۔

وہ ایک ممتاز خاندان کی نہایت ہونہار بچی تھی۔ آرٹ کی طالبہ، والدہ اہلِ قلم، والد ادیب بھی اور شاعر بھی اور اس کے ساتھ حکومتِ پاکستان کی طرف سے، ہندوستان میں ایک اعلیٰ منصب پر فائز۔ بچی نے تین دن بعد، اپنی بیسویں سالگرہ منانے کے لئے اپنے ابو کے پاس جانا تھا کہ اسے بخار آیا، اور 8 اپریل کی شام حالت اچانک بگڑ گئی اور اس حد تک کہ معالج نے، جو خود ایک ماہر ڈاکٹر تھے، فیصلہ کیا کہ اسے فوراً آکسیجن ملنی چاہئے۔ اسلام آباد کے پالی ٹیکنیک ہسپتال میں لیبارٹری نہیں۔ اس کے لئے نیشنل ہیلتھ لیبارٹری کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ وہ لیبارٹری دو بجے بند ہوجاتی ہے اور اس وقت ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ مریضہ کی والدہ کار میں بیٹھیں۔ بچی کو اپنی گود میں لٹایا اور اس کے چھوٹے بھائی' اور ڈاکٹر کے ہمراہ' تیزی سے ۔۔۔' ہسپتال' راولپنڈی کی طرف روانہ ہوگئے۔ وقت کا ایک ایک لمحہ مریضہ کی کش مکش موت وحیات میں اضافہ کئے جارہا تھا' اس بیم ورجا کے عالم میں یہ مسافت خدا خدا کر کے طے ہوئی۔ چھ بج کر دس منٹ پر ان کی کار، (M.I. ROOM) کے سامنے کھڑی تھی۔ حالات کی نزاکت کا تقاضا تھا کہ مریضہ کو ایک ثانیہ کی تاخیر کے بغیر آکسیجن مل جائے۔ لیکن اور یہی ''لیکن'' ہے جس کے لئے ہم نے اس جانگداز واقعہ کو اپنے ہاں پیش کرنے کی ضرورت سمجھی ہے وہ لیکن یہ ہے کہ ہسپتال کے اس وقت کے انچارج نے کہا کہ مریضہ چونکہ (Civilian) ہے اس لئے اسے ویسے ہی داخل نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لئے پہلے فلاں فلاں فارم پُر کرنے ہوں گے۔ اتنی رقم پیشگی جمع کرانی ہوگی۔ اس کے بعد متعلقہ اتھارٹی کی اجازت سے مریضہ کو داخل کیا جاسکے گا۔

> اس نظامِ حکومت کو بیوروکریسی کہا جاتا ہے۔ یعنی ''میزوں کی حکومت'' (اس لفظ کے بنیادی معنی یہی ہیں)۔ فائلوں کی حکومت۔ کاغذوں کی حکومت۔ اس نظامِ حکومت میں سب سے زیادہ قابل' دیانتدار' ذمہ دار' معتمد علیہ افسر' اسے سمجھا جاتا ہے جو متعلقہ افراد کو انسان سمجھے بغیر' ان کے معاملات کا متعلقہ قواعد وضوابط کے مطابق فیصلہ کردے۔

مریضہ زندگی کے آخری سانس گن رہی تھی۔ حرماں نصیب ماں، اسے اپنی گود میں لئے حسرت بھری نگاہوں سے اس کی ڈوبتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر مایوسی کے آخری لمحات میں اس کی نبض ٹٹول رہا تھا۔ اس کا بھائی (Formalities) کی تکمیل کے لئے اِدھر اُدھر مارا مارا پھر رہا تھا۔ چھ بج کر پچاس منٹ پر خدا خدا کر کے یہ مراحل طے ہوئے تو انچارج صاحب نے ملازموں سے کہا کہ مریضہ کو اندر لے آؤ۔ وہ کار کے قریب پہنچے لیکن مریضہ لرزتے ہوئے ہونٹوں سے اپنی ماں کو الوداعی سلام کر کے پہلے ہی جا چکی تھی۔

ہسپتال کی انتظامیہ مطمئن تھی کہ انہوں نے قواعد وضوابط کی خلاف ورزی نہیں ہونے دی۔

❁❁❁❁❁

اور یہ بھی اسی اسلام آباد کا واقعہ ہے۔ وقاص شاہین، ایک چھوٹا سا بچہ خون کے سرطان کے مہلک مرض کا شکار ہے جس کا پاکستان میں علاج نہیں ہوسکتا۔ غریب باپ کی فریاد کسی نہ کسی طرح صدرِ مملکت کے کانوں تک پہنچ گئی اور انہوں نے وزیرِ صحت کے مشورہ کے بعد، از راہِ شفقت اور ہمدردی، حکم صادر فرمایا کہ بچے کو سرکاری اخراجات پر علاج کے لئے باہر بھیج دیا جائے۔ اس پر اس مریض کے نام کا فائل کھل گیا۔ یہ فائل، ایوانِ حکومت کی غلام گردشوں میں چکر لگا رہا ہے۔۔۔ کبھی ایک منسٹری میں، کبھی دوسری میں۔ فائل چکر پر چکر کاٹ رہا ہے اور بچے کی حالت نازک سے نازک تر ہوتی جارہی ہے۔ غریب باپ ایک ایک کی منتیں کررہا ہے۔

یہ خبر روزنامہ دی مسلم کی 6 مئی 1981ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔ معلوم نہیں اس کے بعد اس فائل اور اس بچے پر کیا بیتی؟ ❶

❁❁❁❁❁

ہم نے نہ تو پہلا واقعہ اس لئے درج کیا ہے کہ متعلقہ ہسپتال کے ذمہ دار اربابِ انتظامیہ کے رویہ کے خلاف کوئی شکایت کی جائے اور نہ ہی دوسرا واقعہ۔ اس لئے کہ متعلقہ محکموں کے جہانِ سنگ وخشت میں انسانی قلب کی تلاش کی جائے۔ ہم نے ان واقعات کو (جو اسی قسم کے سینکڑوں واقعات کی مثالیں ہیں) کسی اور مقصد کے لئے درخورِ اعتنا سمجھا ہے۔

بیوروکریسی:

ان واقعات کے ذمہ دار نہ تو متعلقہ ہسپتال کے اربابِ بست وکشاد ہیں اور نہ ہی ان محکموں کے احبابِ حل وعقد۔ اس کا ذمہ دار ہے وہ نظامِ حکومت جسے بیوروکریسی کے (Bureaucracy) کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ اور اس کا (غلط العوام ترجمہ) ''نوکرشاہی'' آپ نے سینکڑوں بار پڑھا اور سنا ہوگا لیکن اس کے مفہوم یا مطلوب پر کم غور کیا ہوگا۔

---

❶ 28 مئی 1981ء کے ''دی مسلم'' میں یہ خبر چھپی ہے کہ اس بچے کی حالت بے حد نازک ہوچکی ہے اور فائل ابھی تک، سپوٹنک کی طرح، دفاتر کی لامتناہی فضاؤں میں گھوم رہی ہے۔ صدرِ مملکت نے کہا تھا کہ بچے کے باپ کو، جو سرکاری ملازم ہے، کسی ایسے ملک میں تعینات کر دیا جائے جہاں اس کے بچے کا علاج ہوسکے۔ یہ ڈیڑھ ماہ پہلے کی بات ہے۔ سوچئے کہ جس نظام میں صدرِ مملکت کے حکم کی تعمیل اس طرح ہوتی ہو، وہاں عام معاملات کا حشر کیا ہوتا ہوگا؟

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب کوئی نئی مشین باہر سے آتی ہے تو اس کے ساتھ ایک پمفلٹ ہوتا ہے جس میں اس مشین کے کل پرزوں کی تفصیل درج ہوتی ہے اور یہ بتایا گیا ہوتا ہے کہ مشین میں فلاں نقص پیدا ہوجائے تو کیا کرنا چاہئے۔ اس مشین کا اپریٹر اس مشین کو چلاتا رہتا ہے اور اگر اس میں کوئی نقص پیدا ہوجائے تو جھٹ سے پمفلٹ کھول کر متعلق ہدایات کا مطالعہ کرتا اور ان کے مطابق مشین کی اصلاح کر دیتا ہے۔ اس سارے عمل میں ایک بات قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ ایسا کرتے وقت اس کا صرف دماغ کام کرتا ہے اس کے دل کا اس سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ دل کا واسطہ انسان سے ہوتا ہے مشینوں سے نہیں۔

مغرب کی مادہ پرستی (Materialism) سے جب تصورِ حیات میں تبدیلی آئی تو اس کی رُو سے انسانوں کو بھی مشینیں تصور کرلیا گیا۔ اسے کہتے ہیں (Mechanical Concept of Life)۔ اس سے انسانوں کے (Human Beings) ہونے کا تصور ختم ہوگیا۔ اور ان کے معاملات کا حل اسی طریق سے سوچا جانے لگا جس طریق سے کسی مشین کا نقص دُور کیا جاتا ہے۔ اس طریق کی رو سے انہوں نے حکومتی نظم ونسق کے لئے بھی قواعد وضوابط منضبط کئے اور ان کے پمفلٹ متعلقہ شعبوں میں بانٹ دیئے۔ منتظمہ کے کارپردازوں کو ان قواعد وضوابط کی تعلیم دی گئی اور انہیں سمجھا دیا گیا کہ جو مسئلہ (Case) ان کے سامنے آئے اس کے متعلق دیکھ لیا جائے کہ، اس پمفلٹ میں کیا لکھا ہے۔ اس کے مطابق اس معاملہ کا تصفیہ کر دیا جائے اور ایسا کرنے میں کسی انسانی تقاضا کو دخل انداز نہ ہونے دیا جائے۔ ان انسانوں کو مشین سمجھا جائے اور اپنے آپ کو مشین کا آپریٹر۔ اس نظامِ حکومت کو بیوروکریسی کہا جاتا ہے۔ یعنی ''میزوں کی حکومت'' (اس لفظ کے بنیادی معنی یہی ہیں)۔ فائلوں کی حکومت۔ کاغذوں کی حکومت۔ اس نظامِ حکومت میں سب سے زیادہ قابل' دیانتدار' ذمہ دار' معتمد علیہ افسر' اسے سمجھا جاتا ہے جو متعلقہ افراد کو انسان سمجھے بغیر' ان کے معاملات کا متعلقہ قواعد وضوابط کے مطابق فیصلہ کر دے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اسے بھی اس کا اطمینان ہوجاتا ہے کہ اس نے اپنے فرائض کو پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا کر دیا، اور افسرانِ بالا بھی اس کی فرض شناسی کی تعریف کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو اس سے واسطہ نہیں ہوتا کہ اس سے انسانیت پر کیا بیتی؟ یہ گوشہ ان کی ذمہ داری کے احاطہ ہی میں نہیں ہوتا۔

> آج ہمارا معاشرہ جس اضطرابِ پیہم کی آماجگاہ بن رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں انسانی معاملات کا فیصلہ قواعد وضوابط کے مطابق' دیانتدارانہ طور پر کیا جاتا ہے، وہاں انسانی تقاضوں (Human Consideration) کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔۔۔ وہاں ترجیح ''فارمز کے پُر کرنے'' کو دی جاتی ہے، انسانی زندگی کو نہیں۔

جب اس ہسپتال کے ملازمین نے، قواعد وضوابط کی پابندی کے مطابق ہسپتال کا دروازہ نہیں کھولا تھا تو وہ پوری طرح مطمئن تھے کہ انہوں نے جو کچھ کیا ہے ٹھیک کیا ہے۔ انہیں اس سے غرض نہیں تھی کہ اس سے اس مریضہ کا انجام کیا ہوا؟ حتیٰ کہ اگر مرحومہ کی موت کے متعلق کوئی انکوائری بھی ہو' اور یہ ثابت ہوجائے کہ انہوں نے جو کچھ کیا تھا قاعدے اور قانون کے مطابق کیا تھا، تو انہیں اس کے لئے موردالزام نہیں ٹھہرایا جائے گا۔ اس کے برعکس' اگر یہ معلوم ہوجائے کہ انہوں نے کسی قاعدے کی

خلاف ورزی کی تھی (خواہ وہ مریضہ کی جان بچانے کے لئے ہی کیوں نہ ہو) تو انہیں چارج شیٹ دید یا جائے گا۔ بیوروکریسی کا یہی تقاضا ہے۔

بیوروکریٹ اس نظام کو اس لئے گلے سے لگائے رکھتے ہیں کہ اس میں انہیں نہ معاملات کے فیصلہ میں چنداں کاوش کرنی پڑتی ہے، نہ اس کے عواقب کی کوئی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے۔ جب وہ متنازعہ امور کا فیصلہ متعلقہ قواعد وضوابط کی رُو سے (میکانکی طور پر) کر دیتے ہیں تو اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوجاتے ہیں۔ یہ خلش انہیں ستاتی ہی نہیں کہ اس سے ''انسانیت'' پر کیا گزری ہے؟

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام　　　　کشتی کسی کی پار لگے، درمیاں رہے

آج ہمارا معاشرہ جس اضطرابِ پیہم کی آماجگاہ بن رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں انسانی معاملات کا فیصلہ قواعد وضوابط کے مطابق' دیانتدارانہ طور پر کیا جاتا ہے، وہاں انسانی تقاضوں (Human Consideration) کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔۔۔ وہاں ترجیح ''فارمز کے پُر کرنے'' کو دی جاتی ہے، انسانی زندگی کو نہیں۔ اور جہاں ان ضوابط میں لچک پیدا کی جاتی ہے تو اس کا جذبۂ محرکہ ذاتی مفادات (رشوت ستانی اور بدعنوانی) ہوتا ہے۔ نتیجہ دونوں کا کرب واضطراب اور عدمِ سکون واطمینان ہوتا ہے۔

۞۞۞۞۞

ان لوگوں کی یہ ذہنیت اور یہ اندازِ عمل' ان کی سرکاری زندگی تک ہی محدود نہیں رہتا۔ رفتہ رفتہ یہ ان کی فطرتِ ثانیہ بن جاتا ہے۔ معاشرتی زندگی کا کوئی گوشہ ہو' ان کے تعلقات اور روابط یکسر مشینی بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان میں انسانی حسیات کی رعایت یا جذبات کی لطافت کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ اُن کے گھر کی زندگی بھی ''بابوآنہ'' بن کر رہ جاتی ہے۔ آپ نے کھانے پینے کی بعض درآمدی چیزوں پر لکھا دیکھا ہوگا:

Un-Touched by Hand During Manufacture.

ان کے بنانے کے دوران ہاتھ کو نہیں چھونے دیا گیا۔

ان حضرات کی زندگی بھی کچھ ایسی ہی ہوجاتی ہے۔ یہ بالکل (Robots) مشینی انسان بن کر رہ جاتے ہیں [1]۔

جب خود اپنے بال بچوں کے ساتھ ان کا رویہ اس قسم کا مشینی ہو، تو دوسرے انسانوں کے ساتھ اُن کے برتاؤ میں لوچ کیسے آسکے گی۔ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

بملازمان سلطان خبرے دہم ز رازے　　　　کہ جہاں تواں گرفتن بہ نوائے دل گدازے

---

[1] ان میں مستثنیات بھی ہوتے ہیں جو اس جہانِ سنگ وخشت میں ذوقِ لطیف اور حسیاتِ انسانی کو برقرار رکھتے ہیں۔ لیکن ایسا کرنے میں انہیں کس قدر مشقت اٹھانی پڑتی ہے اس کا اندازہ باہر کا آدمی کم لگا سکتا ہے۔

''نوائے دل گداز'' سے یہ آشنا ہی نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ''جہاں گیری'' تو ایک طرف، جب یہ کرسی چھوڑ کر ریٹائرڈ ہوتے ہیں تو انہیں معاشرہ میں ایک بھی ہمنوا نہیں ملتا۔ یہ ''یوسفِ بے کارواں'' کی طرح اکیلے پھرتے رہتے ہیں۔ انہیں وقت گزارنے کے لئے کوئی ٹھکانہ نہیں ملتا۔ قفس کے خوگر پرندے کی طرح اُٹھتے ہیں تو دفتروں کا رُخ کر لیتے ہیں لیکن وہاں کی فضا ایسی بدلی ہوئی پاتے ہیں کہ پہلے برآمدے میں ان کے پاؤں کی آہٹ پا کر بابو لوگ کمرے کے اندر اپنی نشستوں سے اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور اب کیفیت یہ ہوتی ہے کہ کمروں کے اندر جاتے ہیں تو کوئی کرسی تک کی پیش کش نہیں کرتا۔ یونہی جھوٹی ہنسی کے ساتھ کبھی اس کے پاس کبھی اُس کے پاس کھڑے ہو کر واپس آجاتے ہیں۔ میر تقی نے غالباً انہی کے متعلق کہا تھا کہ۔

تیرے کوچے ہر بہانے یوں ہی دن سے رات کرنا ۔۔۔ کبھی اس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

اس سے کہیں زیادہ عبرت انگیز اور قابلِ رحم اُن کی ایک اور حالت ہوتی ہے۔ ریٹائرڈ ہوتے ہیں تو ''فتوحاتِ بالائی'' کا سلسلہ بھی ختم ہو جاتا ہے اور جو پنشن ملتی ہے، وہ تنخواہ کے نصف سے بھی کم ہوتی ہے، لیکن پنشن اُسی دن نہیں مل جاتی اُسے منظور کرانے کے لئے دنوں، مہینوں، سالوں تک دفتروں کے چکر لگانے پڑتے ہیں اور وہاں کے مشینی انسان ان کی حالتِ زار پر کبھی ترس نہیں کھاتے۔ بعض تو انہیں چکروں کے راستے عدم آباد تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ ہر ایک سے شکایت ہی نہیں فریاد کرتے ہیں کہ پنشن سے متعلق دفاتر کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے انسان نہیں پتھر کے بُت ہیں جنہیں اس کا قطعاً خیال نہیں آتا کہ مجھ پر اور میرے بال بچوں پر کیا گزر رہی ہے۔

> قرآنی نظامِ عدل اور بیوروکریسی کے نظامِ عدل میں بنیادی فرق ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ بیوروکرٹیک نظام میں نہ مجرموں کو انسان سمجھا جاتا ہے، نہ جج کے سینے میں دھڑکنے والا دل ہوتا ہے۔ اس میں ضابطۂ قوانین کی حیثیت اور کیفیت اس پمفلٹ کی سی ہوتی ہے کہ جس میں مشین کی تفصیلات درج ہوتی ہیں۔ جج اس مشین کا اپریٹر ہوتا ہے، جو آنکھیں بند کر کے اس کی ہتھی گھما دیتا ہے۔ اس میں انسانی (Consideration) کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

ایسا کہتے وقت انہیں قطعاً یاد نہیں رہتا کہ کل تک وہ بھی اِنہیں کرسیوں پر پتھر بن کر بیٹھے رہتے تھے اور انہیں بھی کبھی کسی کے حالِ زار پر ترس نہیں آتا تھا۔ وہ ہر غرض مند کو یہ کہہ کر دھتکار دیتے تھے کہ میں قواعد و ضوابط کے ہاتھوں مجبور ہوں۔

مذہب میں مشینی عمل:

مذہب کی دنیا میں پہنچ کر یہ رسوم پرستی اور ہی گل کھلاتی ہے۔ الدین زندگی کے حدود متعین کرتا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے فرد کو فکر و عمل کی آزادی ہوتی ہے۔ اس کے لئے اسے اپنے لئے آپ فیصلہ کرنا اور اس فیصلے کی ذمہ داری قبول کرنا ہوتا ہے۔ اسے دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ فیصلہ ان مقاصد کی سمت ایک قدم ہے۔ جسے الدین نے متعین کیا ہے اور وہ مقصد ہے۔ مَا يَنۡفَعُ النَّاسَ ۔۔۔(13:17) ''جو نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو''۔ اس سے اس فرد کی ذات میں بھی انسانی

صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے، اور اس کے معاشرہ میں بھی نکھار پیدا ہوتا ہے۔ لیکن مذہب میں اس کی آزادی اور خود فیصلہ لینے کی صلاحیت کو کچل کر رکھ دیا جاتا ہے۔ آپ فقہ کی کسی کتاب کو اٹھا کر دیکھئے۔ اس میں انسان کے ایک ایک قدم کے لئے متعین ''شرعی احکام'' منضبط ملیں گے۔ بیٹھو اس طرح۔ اٹھو اس طرح۔ چلو اس طرح۔ سوؤ اس طرح، کھاؤ اس طرح پیو اس طرح۔ غسل اس طرح کرو۔ بیت الخلاء میں یوں جاؤ۔ حتیٰ کہ اس میں میاں بیوی کے جنسی اختلاط کے لئے بھی قواعد وضوابط ہوں گے۔ ان قواعد وضوابط کی پابندی میکانکی طور پر کی جائے گی کیونکہ ان سے مقصد، ان کی پابندی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ کہ جو شخص جتنا زیادہ ان حکام کا پابند ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا (76:10)۔۔۔ قسم کی چوبِ خشک بن جائے گا جس میں انسانی زندگی کی لوچ اور لچک کا شائبہ تک نہیں ہوگا۔ دہلی میں ایک بہت بڑے مفتی صاحب تھے۔ ان کی بدنصیب بیوی اکثر بیمار رہتی تھی۔ وہ ایک دن اس سے کہہ رہے تھے کہ نکاح نامہ کی رُو سے تمہارا نان ونفقہ تو میرے ذمے ہے، علاج معالجہ نہیں۔ اس کے لئے تمہیں اپنے ماں باپ سے کہنا ہوگا۔ اس قسم کی بن جاتی ہے ''فطرت'' ان لوگوں کی جو احکامِ شریعت کی پابندی اس طرح کرتے ہیں۔ پھر، چونکہ یہ اپنے آپ کو بے حد متقی اور پرہیزگار سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان میں بے حد تکبر اور نخوت پیدا ہوجاتا ہے۔ وہ ساری دنیا سے خفا رہتے اور دوسروں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں' کیونکہ وہ ان کی نگاہ میں فاسق وفاجر' جہنم کے کندے ہوتے ہیں۔ اس سے وہ عجیب قسم کی مخلوق بن جاتے ہیں جن میں نہ زندگی کی لطافت ہوتی ہے، نہ انسانیت کی لچک۔ بیوروکریسی کی طرح ان کی بھی اپنی الگ برادری ہوتی ہے۔ جس طرح اُن کے ہاں (D.F.A) اور (P.U.C) کے سوا کوئی موضوع گفتگو نہیں ہوتا۔ ان کے ہاں بھی ساری زندگی ''مکروہ اور مباح'' کی بحثوں میں سمٹ اور سمٹا کر رہ جاتی ہے اور ان کے فتوؤں میں انسانی زندگی کہیں جگہ نہیں پاتی۔ یہ انسان نہیں ''قرآن کے الفاظ میں ''خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ'' (63:4) بن کر رہ جاتے ہیں۔

مجسٹریٹ نے چوری کے مجرم کو چھ ماہ کی قید کا حکم سنا دیا۔ ضابطہ تعزیرات کی رُو سے یہ بالکل ٹھیک تھا۔ یہ مجرم، اپنے بیوی بچوں اور بوڑھے ماں باپ کا واحد کفیل تھا۔ قانون نے اپنا تقاضا پورا کرلیا لیکن کسی نے یہ نہ دیکھا کہ چھ ماہ تک اتنے بڑے غریب خاندان کی روٹی کا کیا ہوگا!

۞۞۞۞۞

نظامِ عدل:

مذہب کی بات چھڑی تو معاملہ دُور تک جا پہنچا۔ قرآنِ کریم نے بھی قواعد وضوابط اور احکام وقوانین دیئے ہیں' اور ان کی پابندی ضروری قرار دی ہے۔ ان احکام وقوانین کی رُو سے معاشرہ میں نظامِ عدل قائم ہوتا ہے' اور نظامِ عدل کو قرآن نے بڑی اہمیت دی ہے۔ لیکن قرآنی نظامِ عدل اور بیوروکریسی کے نظامِ عدل میں بنیادی فرق ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ بیوروکریٹک نظام میں نہ مجرموں کو انسان سمجھا جاتا ہے، نہ جج کے سینے میں دھڑکنے والا دل ہوتا ہے۔ اس میں ضابطۂ قوانین کی حیثیت اور کیفیت

اس پمفلٹ کی سی ہوتی ہے کہ جس میں مشین کی تفصیلات درج ہوتی ہیں۔ جج اس مشین کا اپریٹر ہوتا ہے، جو آنکھیں بند کر کے اس کی ہتھی گھما دیتا ہے۔ اس میں انسانی (Consideration) کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ بات دو ایک مثالوں سے واضح ہو جائے گی۔ ایک کا تعلق قانونِ شریعت سے ہے، دوسری کا ملکی قانون سے۔

فتویٰ:

ایک شخص غصے سے مغلوب ہو کر اپنی بیوی کو طلاق، طلاق، طلاق کہہ دیتا ہے۔ غصہ فرو ہونے پر وہ اپنی حماقت پر نادم ہوتا ہے اور مفتی صاحب سے پوچھتا ہے کہ اس غلطی کے ازالے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ وہ فرماتے ہیں کہ شریعتِ حقہ کی رُو سے اس کی ایک ہی صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ تمہاری بیوی کسی اور شخص سے نکاح کرے۔ ایک رات کی ''شب باشی'' کے بعد وہ اُسے طلاق دے دے اور اس کے بعد تم اس سے دوبارہ نکاح کرو۔

یہ سُن کر پانچ چھ بچوں کی ماں، پچاس سالہ بڑھیا پر قیامت گزر جاتی ہے۔ وہ اس قسم کی بے غیرتی کا تصور تک نہیں کر سکتی۔ وہ روتی ہے، بلبلاتی ہے اور مفتی صاحب سے کہتی ہے کہ غلطی اور حماقت تو اس کے خاوند نے کی اور اس کی اس قدر شرم ناک سزا اسے دی جا رہی ہے۔ کس جرم کی پاداش میں؟ مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ فقہ میں ایسا ہی کہا گیا ہے۔ شریعت کا یہی حکم ہے۔ میں اس میں تبدیلی نہیں کر سکتا۔

قطعِ نظر اس کے کہ یہ شرعی حکم بھی ان حضرات کا خود ساختہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس شریعت میں اس قسم کی مظلوموں کی غیرت وحمیت کی کوئی گنجائش نہیں؟ یہ عفت مآب، انسان نہیں، مشین ہے! مفتی صاحب ان سوالات کا جواب دینے کے لئے اپنے آپ کو مکلّف نہیں پاتے۔ وہ فتوٰے صادر فرما دیتے ہیں اور مطمئن ہو جاتے ہیں کہ انہوں نے شریعتِ حقہ کا تقاضا پورا کر دیا۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذَالِكَ!

سزا کس کو ملی؟:

مجسٹریٹ نے چوری کے مجرم کو چھ ماہ کی قید کا حکم سنا دیا۔ ضابطہ تعزیرات کی رُو سے یہ بالکل ٹھیک تھا۔ یہ مجرم، اپنے بیوی بچوں اور بوڑھے ماں باپ کا واحد کفیل تھا۔ قانون نے اپنا تقاضا پورا کر لیا لیکن کسی نے یہ نہ دیکھا کہ چھ ماہ تک اتنے بڑے غریب خاندان کی روٹی کا کیا ہوگا! مجرم کو تو اپنے جرم کی سزا ملی، لیکن اس خاندان کو کس جرم کی پاداش میں یہ سزا ملی؟۔۔۔ اور سزا بھی ایسی جو مجرم کی سزا سے بھی زیادہ سخت ہے۔ مجرم کو جیل خانہ میں التزاماً روٹی ملتی رہے گی لیکن اس خاندان کی روٹی کی ذمہ داری کسی کے سر پر نہیں ہوگی! قانون اور عدالت کی نگاہوں میں یہ انسان ہیں ہی نہیں! مجرم کے بچے بھوک سے مر جائیں گے تو اس سے اس مجسٹریٹ (یا واضعین قانون) کے دل میں نہ کوئی کھٹک پیدا ہوگی، نہ ان سے کسی قسم کی باز پُرس ہوگی!

قرآنی نظامِ عدل:

قرآنی نظامِ عدل میں، انسانی پہلو کو مقدم رکھا گیا ہے۔ اس نظام کا مقصد فرد اور معاشرہ کی اصلاح ہے، اس لئے قوانینِ

خداوندی میں بھی اسی پہلو کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے اور ان قوانین کے اطلاق میں بھی اسی پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔یعنی اس میں جج صاحبان کا فریضہ یہ نہیں ہوتا کہ ان قوانین کو مشین کی طرح نافذ کر دیا جائے۔ان کا فریضہ یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ قانون کی مذکورہ بالا غرض وغایت کس طرح پوری ہوتی ہے۔یعنی قانون اس غرض وغایت کے حصول کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ہم پہلے دو ایک مثالیں اس امر کی پیش کریں گے کہ قانون سازی کے سلسلہ میں انسانی پہلوؤں کی کس قدر رعایت رکھی گئی ہے اور اس کے بعد یہ بتائیں گے کہ قرآن کے تعزیراتی قوانین کے اطلاق میں اس پر کس قدر زور دیا گیا ہے۔ پہلے قانون سازی کا گوشہ لیجئے۔

قرآنی قوانین

(1) تاریخ اجراء سے پہلے:

قرآن کا پہلا اصول یہ ہے کہ قانون کا اطلاق اس کی تاریخِ اجراء سے ہوگا۔اس سے پہلے جو کچھ ہو چکا، ہو چکا۔اس پر کوئی گرفت نہیں کی جاسکتی۔اس نے جہاں بھی کسی نئے قانون کا تعین کیا ہے، ساتھ ہی کہہ دیا ہے:(23؛4:23؛8:38؛2:275)''پہلے جو ہو چکا، ہو چکا۔سوچئے کہ اس سے افرادِ معاشرہ کو کس قدر اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

(2) قانون سے عدمِ واقفیت:

سیکولر قانون یہ ہے کہ قانون سے عدم واقفیت، اس کی خلاف ورزی کی وجۂ جواز نہیں ہوسکتی۔مجرم قانون سے واقف ہو یا نہ، اسے بہرحال سزا ملی رہے گی۔قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ جو خلاف ورزی قانون سے ناواقفیت کی بنا پر سرزد ہو، وہ نا قابلِ معافی ہے۔افرادِ معاشرہ کو قانون سے آگاہ کرنا،حکومت کی ذمہ داری ہے۔اگر حکومت اپنی اس ذمہ داری کے پورا کرنے میں قاصر رہتی ہے تو اس کی سزا افرادِ معاشرہ کو کیوں ملے؟(16:119؛6:54)۔

(3) ارتکابِ جرم میں دل کا ارادہ شامل ہو:

اگلا اصول یہ ہے کہ ارتکابِ جرم میں دل کا ارادہ شامل ہو،وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ (5:33؛2:225)اس سے دیکھئے کہ مقدمہ کا فیصلہ کرنے والے جج پر کس قدر ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟ وہ کسی مشین کی نقل وحرکت کا فیصلہ نہیں کر رہا۔انسانوں کے عمل واقدام کا جائزہ لے رہا ہے۔اس کے لئے احوال وکوائف اور نفسیاتِ انسانی کی جن گہرائیوں تک جانے کی ضرورت ہوگی، وہ ظاہر ہے۔

(4) اضطراری حالت:

قرآنِ کریم نے جہاں کھانے پینے کی چند ایک چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، وہاں ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا ہے کہ: فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ (2:173) یعنی اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ کھانے کے لئے اور کچھ نہ ملے اور تم (جان بچانے کے لئے) مجبور ہو جاؤ، تو ایسی حالت میں ان چیزوں کو بھی کھا سکتے ہو جنہیں حرام قرار دیا گیا ہے، بشرطیکہ تم واقعی مجبور ہو جاؤ اور تمہاری نیت قانون شکنی اور یا ہوس پروری کی نہ ہو۔

قرآنِ کریم نے یہ استثناء بہ نصِ صریح کھانے پینے کی چیزوں کے ضمن میں روا رکھی ہے لیکن بعض دوسرے حالات میں بھی اضطراری حالت پیدا ہوسکتی ہے مثلاً حفاظتِ خود اختیاری کے لئے کسی کو قتل کر دینا۔ جج صاحبان کے لئے یہ متعین کرنا بھی ضروری ہوگا کہ ایسا عمل اضطراراً کیا گیا ہے۔ اس کے لئے بھی گہرے غور وتدبر اور انسانی پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت ہوگی۔

واضح رہے کہ یہ اضطراری گنجائش ہر تقاضے کے لئے نہیں ہے۔ مثلاً اس نے بھوک پیاس کی صورت میں تو اضطرار کو تسلیم کیا ہے، جنسی تقاضوں میں اسے تسلیم نہیں کیا۔ اس کے برعکس اس نے کہا ہے کہ اگر جائز طریق سے جنسی تقاضے کی تسکین کی صورت نہ ہو، تو ضبطِ نفس سے کام لیا جائے (24:33)۔ لہٰذا اضطرار کوئی ایسی گنجائش نہیں کہ جہاں جی چاہے اس سے فائدہ اٹھالیا جائے اور اس طرح ہر ناجائز کام کو جائز قرار دے دیا جائے۔ فیصلہ کرنے والی اتھارٹی کو اس باب میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوگی۔

۞۞۞۞۞

اب آیئے تعزیرات کی طرف۔ اس نے کہا ہے کہ جس شخص کے خلاف کسی جرم کے ارتکاب کا الزام عائد کیا جائے، اس کے خلاف پہلا ردِ عمل یہ ہونا چاہئے کہ ہوسکتا ہے یہ الزام جھوٹا ہو۔ یعنی پہلا ردِ عمل اسے مجرم تصور کرنے کا نہیں، بلکہ محض ملزم تصور کرنے کا ہونا چاہئے۔ سورۃ النور میں جہاں اس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے جسے عام طور پر واقعہ اِفک کہا جاتا ہے (اور جہالت یا سازش کے تحت، حضرت عائشہؓ کو اس میں ملوث قرار دیا جاتا ہے) وہاں دوبار سختی سے کہہ دیا کہ جب فتنہ پردازوں نے اس فتنہ کو ہوا دی تھی تو تمہیں بلا ساختہ کہہ دینا چاہئے تھا کہ: هٰذَآ اِفۡكٌ مُّبِيۡنٌ (24:12)، هٰذَا بُهۡتَانٌ عَظِيۡمٌ (24:16)۔ یہ محض تہمت تراشی ہے۔ یہ بہتان ہے آپ غور کیجئے کہ اس سے ملزم اور معاشرہ پر کیسا خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ ہمارے ہاں کے سیکولر نظام میں، جو کچھ ''ملزموں'' کے ساتھ ہوتا ہے (یعنی جنہیں محض شبہ کی بنا پر شاملِ تفتیش کر لیا جاتا ہے اور آگے چل کر ثابت ہوجاتا ہے کہ وہ بے گناہ ہیں) کہ اکثر اوقات وہ اس اذیت سے بچنے کے لئے یا تو جھوٹا اقبال جرم کر لیتے ہیں اور یا (بعض اوقات) خودکشی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

معاشرہ، انتظامیہ اور عدالت کی طرف سے اس ردِعمل (یعنی ملزم کو بے گناہ سمجھنے) کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملزم کی عزتِ نفس کو ٹھیس نہیں لگتی۔ قرآنی نظام کی غایت، احترامِ آدمیت کا برقرار رکھنا ہے۔ ملزم تو ایک طرف، وہ تو مجرم کو بھی نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا! بلکہ اس کی لغزش پر اس سے اظہارِ ہمدردی کرتا ہے۔ مجرموں کی تباہی پر، خود خدا بے ساختہ پکارتا ہے کہ: يٰحَسۡرَةً عَلَى الۡعِبَادِ (36:30) ''اور میرے بندو! کس قدر تاسف انگیز اور حسرت ناک ہے تمہاری یہ حالت!'' وہ جرم سے نفرت کی تلقین کرتا ہے، مجرم سے نہیں اور ان دونوں میں فرق کرنا عمیق بصیرت چاہتا ہے۔ قرآنی نظامِ عدل کا یہی تقاضا ہے۔ بعض جرائم ایسے شنیع ہوتے ہیں کہ اُن سے مستغیث کے دل میں غصے کے جذبات اُبھر آتے ہیں۔ قرآنِ کریم مومنین کی صفات یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ ایسی حالت میں بھی عفو اور درگزر سے کام لیتے ہیں۔ (42:37) حضرت عمرؓ نے اسی بنا پر کہا تھا کہ کسی کے صحیح کردار کا معلوم کرنا ہو تو اسے غصے کی حالت میں پرکھنا چاہئے۔

معافی:

اب ہمارے سامنے وہ مقام آتا ہے جہاں قرآنی نظام، دنیا کے ہر نظامِ عدل سے منفرد نظر آتا ہے۔ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جاچکا ہے) قرآنی نظامِ عدل کی غایت افراد اور معاشرہ کی اصلاح ہے، وہ اسے ترجیح دیتا ہے کہ یہ مقصد بغیر سزا کے حاصل ہو جائے اور سزا وہیں دیتا ہے جہاں ایسا کرنا ناگزیر ہو۔ اثباتِ جرم کے بعد معاف کر دینے کو عام طور پر رحم (Mercy) کہا جاتا ہے، اور چونکہ عدل اور رحم متضاد عناصر ہیں، اس لئے رحم کو نظامِ عدل کا جزو نہیں قرار دیا جاتا۔ اسے ''ترحمِ خسروانہ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ میں آگے چل کر اس کی وضاحت کروں گا کہ یہ تمام تصورات غیر قرآنی ہیں۔ قرآن میں اس قسم کے رحم کا تصور نہیں۔ سردست میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قرآنی نظامِ عدل میں سزا اور معافی دونوں کو ہمکنار رکھا گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ: اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (40:3;5:98)۔ ''اسے اچھی طرح سمجھ رکھو کہ خدا مجرموں کا مؤاخذہ کرتے میں بڑا سخت گیر ہے اور اس کے ساتھ ہی معاف کر دینے میں بھی بڑا وسیع الظرف ہے۔''

آگے بڑھنے سے پہلے، دو ایک اہم نکات کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

(1) قرآنِ کریم نے خدا کی جن صفات کا ذکر کیا ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ مومنین میں (علیٰ حدِ بشریت) ان صفات کا منعکس ہونا ضروری ہے اور اس کی محسوس شکل یہ ہے کہ ان کا نظام، ان صفات کا مظہر ہو۔ یعنی اس نے جب کہا ہے کہ خدا شدید العقاب بھی ہے اور غفور رحیم بھی، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی نظام کو ان ہر دو خصائص کا حامل ہونا چاہئے۔ یعنی مجرمین کی گرفت کرنے والا بھی اور معاف کر دینے والا بھی۔

(2) چونکہ ہمارے مروّجہ اسلام کے تصورات اور مسالک دورِ ملوکیت کے وضع کردہ ہیں، اس لئے اس معاشرہ میں، صفاتِ خداوندی کے انعکاس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ استبدادِ ملوکیت کے حامل معاشرہ میں ''خدا'' کا کیا کام؟

مغفرت کے معنی:

اس سے، سوال یہ پیدا ہوا کہ قرآن میں جو صفاتِ خداوندی کا اس قدر ذکر ہے تو اس کا مطلب اور مقصد کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ان صفات کا ظہور آخرت میں ہوگا۔ خدا کافروں کو جہنم رسید کرے گا اور مسلمانوں کے گناہ بخش کر انہیں جنت میں داخل کر دے گا۔ ''بخش دینے'' کی اصطلاح قابلِ غور ہے۔ کیونکہ اس کے گرد ہمارے تصورِ مکافاتِ عمل کی ساری عمارت گردش کرتی ہے۔ ''بخشیش'' کا لفظ تو آپ نے سنا ہوگا۔ یعنی جو چیز بطورِ استحقاق (AS OF RIGHT) نہ ملے۔ بطورِ خیرات ملے۔ اس سے خدا کے بخش دینے کا تصور قائم ہوا۔ یعنی اعمال کے لحاظ سے تو ہم جہنم کے مستوجب ہوں گے لیکن خدا ہمارے گناہ ''بخش دے گا'' اور اس طرح ہمیں جنت بطورِ خیرات مل جائے گی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

بہشتے بہرِ پاکانِ حرم است　　بہشتے بہرِ اربابِ ہمم است
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش!　　بہشتے فی سبیل اللہ ہم است

اور یہیں سے مغفرت کا ترجمہ ''بخشش'' اور غفور کا ترجمہ ''بخشنے والا'' کر دیا گیا۔

تاریخ کے اولیں دَور سے آج تک، بادشاہوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو اختیارات واقتداراتِ خداوندی کا حامل سمجھا اور منوایا ہے۔ ہندوؤں کے راجہ ایشور کے اوتار تھے۔ عیسائیوں کے شاہنشاہ، حقوقِ خداوندی (Divine Rights) کے علمبردار۔ مسلمانوں کے سلاطین، ظل اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ)۔ ان اختیارات کی رُو سے، مملکت کی ہر شے، بادشاہ کی ملکیت ہوتی تھی اور رعایا کو جو کچھ ملتا تھا، اس کی طرف سے ''بخشش'' کے طور پر ملتا تھا۔ انسان کی سب سے قیمتی متاع، اس کی جان ہوتی ہے۔ سلاطین کے اس منصب کی رُو سے، افراد کی جان بھی، ان کی ملک ہوتی تھی اور افراد کے پاس ان کی طرف سے بخشیدہ۔

ترحمِ خسروانہ!

قرآن میں بیان کردہ داستانِ حضرت ابراہیمؑ میں جب انہوں نے بادشاہ سے کہا کہ میرا خدا وہ ہے جس کے ہاتھ میں موت اور زندگی ہے، تو اس نے کہا تھا کہ: اَنَا اُحۡیٖ وَ اُمِیۡتُ ؕ (2:258) نہیں! افراد کی موت اور حیات میرے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ وہ جسے چاہتا۔۔۔ موت کی سزا دے دیتا۔ پھر مجرم اس کے حضور، روتا۔ چیختا۔ گڑگڑاتا۔ نہ صرف ہاتھ جوڑتا بلکہ سجدے بھی کرتا اور انتہائی عجز و لجاجت سے کہتا۔۔۔ کہ حضور میری جان بخشی کر دیجئے۔ اور اس کا ایک اشارۂ ابرو، اس کی ''جان بخش دیتا۔'' اس سے درحقیقت تذلیلِ انسانیت مقصود تھی۔ بادشاہ اپنے مخالفین کو ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ یہ حقوق ہر دَور کے شاہنشاہوں نے اپنے لئے مخصوص رکھے۔ حتیٰ کہ آج کی مہذب دنیا میں بھی، جہاں دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ ملوکیت کا خاتمہ ہو چکا ہے، تمام دنیا کے دساتیر (Constitutions) میں سزائے موت پانے والے مجرموں کی ''رحم کی درخواست'' منظور یا مسترد کرنے کا اختیار سربراہِ مملکت کو حاصل ہوتا ہے۔ یہ وہی نمرود کے تمرد کی صدائے بازگشت ہے۔ وہی روحِ ملوکیت ہے جو آئینی پردوں میں رقصاں ہے اقبالؒ کے الفاظ میں:

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

اس ''ترحمِ خسروانہ'' سے جان تو بخشیش میں مل جاتی ہے لیکن انسانیت کی جس قدر تذلیل ہوتی ہے اس کا اندازہ ہر قلبِ حساس کر سکتا ہے۔ ایک انسان کا اپنے جیسے انسان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہونا اور منتیں کرنا کہ حضور! میری جان بخشی کر دیجئے، اس سے بڑھ کر ایک طرف تمرد اور دوسری طرف تذلیلِ انسانیت اور کیا ہوگی۔ چنانچہ ہمیں تاریخ میں ایسے غیور ''مجرموں'' کے نام جلی حروف میں لکھے ملتے ہیں جنہوں نے جلاد کی تلوار پر پھانسی کے تختے کو قبول کر لیا لیکن اپنے ہی جیسے انسان (سربراہِ مملکت) سے جان کی بھیک مانگنا گوارا نہ کیا۔

غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ:

قرآنِ کریم نے تذلیلِ انسانیت کی اس رسمِ کہن کا خاتمہ کر دیا اور سزا سے معافی کو، کسی حاکم اعلیٰ کی خیرات کی جگہ، خود قانونِ تعزیرات کا جزو بنا دیا۔ یہ بہت بڑا انقلاب تھا جس سے قرآن نے دنیائے انسانیت کو آشنا کرایا۔ آپ کو قرآنِ کریم میں ہر جرم کی سزا کے بعد اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ (2:199) لکھا ملے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قوانینِ خداوندی، شدید

العقاب (سخت مواخذہ) اور غفور رحیم (معافی) دونوں سے مرکب ہیں۔ واضح رہے کہ مغفرت کے معنی ''بخشش'' نہیں۔ اس کے معنی حفاظت ہیں اور غفور کے معنی، بخشنے والا نہیں بلکہ حفاظت کرنے والا ہیں۔ ظاہر ہے کہ قانون کی خلاف ورزی سے معاشرہ میں کچھ نقصان ہوتا ہے، اور خود مجرم کی ذات کا زیاں بھی۔ قرآنی قانون میں اس نقصان کی تلافی کی گنجائش (Provision) رکھ دی گئی اور اس طرح معاشرہ اور اس فرد کو جو نقصان پہنچا تھا، اس کی حفاظت کا سامان بہم پہنچا دیا۔

رحیم کے معنی ''رحم کرنے والا'' نہیں۔ اس کے معنی ہیں، سامانِ نشوونما بہم پہنچانے والا۔ خدا کے غفور رحیم ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کے قانونِ مکافات میں اس کی گنجائش رکھ دی گئی ہے کہ۔۔۔ ارتکابِ جرم سے مجرم کی ذات کا جو نقصان ہوا ہے اسے اس سے محفوظ بھی رکھا جائے اور اس کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما پانے میں جو کمی رہ گئی تھی (اور جس کی وجہ سے اس سے ارتکابِ جرم سرزد ہوا تھا) اسے بھی دُور کر دیا جائے۔

یہ ہے قرآن کی رُو سے معافی سے مراد، جس کی گنجائش ہر جرم کی سزا کے قانون میں موجود ہے۔ ''قانون کے اندر موجود'' ہونے کے معنی یہ ہیں کہ یہ معافی کسی انسان کی طرف سے، خیرات یا بھیک کے طور پر نہیں ملتی۔ مجرم اسے قانونی استحقاق (Legal Right) کے طور پر حاصل کرتا ہے۔ اس طرح اس کی عزتِ نفس بھی مجروح نہیں ہوتی۔

معافی کی شرائط:

لیکن یہ معافی یونہی نہیں مل جاتی۔ یہ ایک اہم شرط سے مشروط ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ: فَمَنۡ تَابَ مِنۡۢ بَعۡدِ ظُلۡمِهٖ وَاَصۡلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوۡبُ عَلَيۡهِ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ (5:39) جو مجرم، ارتکابِ جرم کے بعد اپنے کئے پر دل سے نادم ہو اور آئندہ کے لئے اپنی اصلاح کا عزم کرے (اور مجاز اتھارٹی اس کا اطمینان کرلے کہ اس کی اصلاح کا واقعی امکان ہے) تو اسے ''مغفرت اور رحمت'' کے حق سے نوازا جا سکتا ہے۔ سزا کا مستوجب وہ ہوگا جو جانتے بوجھتے جرم کا ارتکاب کرے اور اپنے جرم پر نادم ہونے کے بجائے، اس پر اصرار کرے۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ معافی کا حقدار وہ ہے: وَلَمۡ يُصِرُّوۡا عَلٰى مَا فَعَلُوۡا وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ (3:135) ''جسے خلاف ورزیٔ قانون کے نقصانات کا علم و احساس ہو۔ اور اس پر اصرار نہ کرے۔'' اس سے یہ بھی واضح ہے کہ قرآن میں جن سزاؤں کا ذکر ہے وہ آخری درجہ پر ''عادی مجرموں'' کے لئے ہیں۔ یعنی جو بار بار ارتکابِ جرم کریں۔

ان تصریحات سے یہ بھی واضح ہے کہ اسلامی نظام میں عدالت کی ذمہ داریاں کس قدر گراں بار ہیں۔ اُسے مشینوں کی طرح قانون کے الفاظ کی پیروی نہیں کرنی ہوتی۔ اسے بہت سے نرم و نازک انسانی گوشوں کا لحاظ بھی رکھنا ہوتا ہے اور قانون کے بہت سے مستور تقاضوں کو پورا بھی کرنا۔

۞۞۞۞۞

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ریاستِ مدینہ کی ذمہ داریاں اوراس کی گراں قدر برکات

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: قُلۡنَا اھۡبِطُوۡا مِنۡہَا جَمِیۡعًا ۚ فَاِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ مِّنِّیۡ ھُدًی فَمَنۡ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ھُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ (2:38) ترجمہ: ہم نے حکم دیا کہ تم سب یہاں سے نیچے جاؤ۔ پھر تم کو میری طرف سے ہدایات آیا کریں گی۔ پس جو ہماری ہدایات پر چلا تو ایسا معاشرہ قائم ہوگا کہ اس میں کسی قسم کا خوف وحزن نہیں ہوگا کیونکہ قرآنِ کریم کا موضوع ہی بہترین اور پُرامن معاشرہ کی تشکیل ہے۔ یہ قرآن نے ایک بڑا واضح چیلنج دیا ہے کہ ہم ہدایات اور بہترین معاشرہ کے اصول وقوانین ہی ایسے دیں گے کہ اگر ان کے مطابق معاشرہ قائم کیا جائے گا تو لازماً اس معاشرہ میں امن وایمان ہوگا اور کسی قسم کا خوف وحزن نہیں ہوگا۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان قوم جو کہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ قوانین پر عمل کرنے کا دعویٰ کرتی ہے۔ دنیا کے ہر مقام پر ان کا معاشرہ فساد سے بھرا ہوا ہے۔ ہماری پیشوائیت اس آیۂ کریمہ میں بیان کردہ امن کو انفرادی طور پر مرنے کے بعد کی زندگی سے نسبت دیتی ہے اور اس طرح اپنے آپ کو اس چیلنج میں کامیاب گردانتی ہے۔ حالانکہ بہت واضح طور پر ارشادِ عالی ہو رہا ہے کہ: ''اھۡبِطُوۡا'' تم سب مل کے اس جنتی زندگی سے نکل جاؤ۔ جب جنتی زندگی سے نکل کے دنیا میں زندگی بسر کرنی شروع کرو گے تو تمہیں انسانیت کے تقاضوں کے مطابق ہدایات ملتی رہیں گی۔ چنانچہ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جب انسان نے تمدنی زندگی شروع کی تو روزِ اوّل سے اس کو تعمیر معاشرہ کے متعلق ہدایات ملنی شروع ہوگئیں اور انبیاء کی بعثت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ چونکہ مسلمانوں نے اس ہدایت کو درست طور پر استعمال نہیں کیا اور ان دینی ہدایات کو بطورِ مذہب انفرادی طور پر استعمال کیا اور دین کو مذہب میں تبدیل کر دیا اس وجہ سے مسلمانوں کے معاشرہ میں امن وامان قائم نہیں ہوسکا۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ ہدایات تو اس دنیا میں اس دنیا کے متعلق آئیں اور نتیجہ اس کا مرنے کے بعد حاصل ہو۔

حضور ﷺ نے ایسا ہی معاشرہ یعنی ریاستِ مدینہ قائم فرمائی تھی جو چشمِ فلک نے صرف ایک مرتبہ ہی دیکھی اور پھر اس کو دوبارہ دیکھنے کے لئے ترس رہی ہے۔ ایسی ہی ریاست کو دین کہتے ہیں۔ جبکہ ان ہدایات پر بغیر اقتدار میں آئے انفرادی طور پر عمل کرنے کو مذہب کہتے ہیں۔ ہم مسلمان تیرہ سو سال سے ان احکامات وہدایات الٰہی پر بغیر اقتدار میں آئے ایک مغلوب قوم کی طرح عمل کر رہے ہیں اور ساری دنیا میں جوتیاں کھا رہے ہیں۔ البتہ گذشتہ صدی میں پہلی مرتبہ تحریکِ طلوعِ اسلام نے

مسلمانوں کو دین کی دعوت دی اور دین کا نظریہ اس طاقت وقوت سے پیش کیا کہ اب ہر مسلم ملک میں اقامتِ دین کا پرچا ہو رہا ہے۔ اس تحریک کی ہی یہ بازگشت ہے جو محترم عمران خان نے آواز لگائی ہے اور ریاستِ مدینہ قائم کرنے کا اعلان کیا ہے۔

محض ضمناً اور اصل مضمون سے ہٹ کر ہم یہ واقعہ نقل کر رہے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ان کا ایک بچپن کا دوست آیا اور اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ عمر (رضی اللہ عنہ) تم نے اسلام کو فروغ دینے میں بہت محنت کی اور تم نے اسلام کو چار چاند لگائے ہیں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس دوست سے کہا کہ میرے دوست تم نے صحیح بات نہیں کی، عمر نے اسلام کو چار چاند نہیں لگائے بلکہ اسلام نے عمر (رضی اللہ عنہ) کو چار چاند لگائے ہیں کیونکہ خطاب کے تو اور بھی اولاد ہے کوئی ان کو پوچھتا تک نہیں۔ ہم محترم عمران خان سے یہی عرض کریں گے کہ اگر انہوں نے قرآن کے ذریعہ ریاستِ مدینہ قائم کر دی تو اسلام ان کو چار چاند لگا دے گا ان کا نام رہتی دنیا میں قائم رہے گا۔

(1) ریاستِ مدینہ چونکہ قرآنِ خالص جاری و نافذ کرتی ہے تو اس ریاست کے احکامات کی اطاعت عبادتِ خداوندی ہوتی ہے اس ریاست میں پرستش اور پرستش گاہیں نہیں ہوتیں۔ ریاستِ مدینہ میں پارلیمنٹ، عدالتیں، تحصیلیں، تھانے یہ سب مساجد اللہ ہوتے ہیں کیونکہ ان عمارات سے احکاماتِ خداوندی جاری ہوتے ہیں، اس ریاست کی کرنسی، جھنڈا، پاسپورٹ، ویزا یہ سب شعائر اللہ ہوتے ہیں۔

(2) یہ ریاستِ مدینہ چونکہ اللہ کے Behalf پر قائم ہوتی ہے اس لئے یہ اللہ تعالیٰ کے وعدے پورے کرتی ہے قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے جو وعدے انسانیت سے کئے ہیں یہ ریاست ان خدائی وعدوں کو پورا کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانیت سے وعدہ فرمایا ہے: وَمَا مِنْ دَآ بَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (11:6) زمین میں کوئی متنفس ایسا نہیں ہے جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو دوسری جگہ ارشادِ گرامی ہے نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ط (17:31) ہم تمہیں اور تمہاری اولاد کو رزق دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پوری انسانیت کے ایک ایک فرد، بلکہ ہر چلنے والے کے رزق کی فراہمی کی جو ذمہ داری لی ہے تو وہ کوئی آسمان سے یہ رزق نہیں پھینکتا بلکہ وہ یہ ذمہ داری اپنے ہی بندوں سے، اس ریاست کے توسط سے پوری کراتا ہے۔ اس نے وعدہ فرمایا کہ تم اللہ کو قرض دو تو وہ اس کے بدلے کئی گنا واپس کرے گا اللہ کو کس طرح قرض دے سکتے ہیں وہ دکھائی بھی نہیں دیتا بلکہ وہ تو ادراک میں ہی نہیں آ سکتا۔ اللہ کو جو قرض دیا جاتا ہے اور اس کے بدلے کئی گنا وصولی ہوتی ہے اس کا ذریعہ ریاستِ مدینہ ہی ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشادِ گرامی ہے کہ اللہ تمہاری جانیں اور مال خرید لیتا ہے اور اس کے بدلے جنت دیتا ہے یہ جنت اسی دنیا میں بھی ملتی ہے یہ جنت یہ ریاست ہی ہوتی ہے اور اسے جنت ارضی کہتے ہیں۔

(3) اس دنیا کا سارا نظام ہی ایسا رکھا گیا ہے کہ بندوں کو خیر وشر کے اکتساب میں مجبورِ محض نہ بنایا جائے۔ اگر صرف خیر کے اکتساب پر سب کو مجبور کر دیا جاتا تو تخلیقِ عالم کی حکمت و مصلحت پوری نہ ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفات ایسی رہ جاتیں کہ ان کے ظہور کے لئے کوئی محل نہ ملتا مثلاً عفو، غفور، حلیم، منتقم، قائم بالقسط وغیرہ حالانکہ عالم کے پیدا کرنے کی غرض ہی یہ ہے

کہ اس کی تمام صفات کا مظاہرہ ہو اور انسانوں اور اس کے بندوں کی معرفت ان پر عمل کیا جائے۔

(4) یہ صفاتِ خداوندی صرف ریاستِ مدینہ میں ہی جاری ہوسکتی ہیں۔ ریاستِ مدینہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان صفاتِ عالی پر عمل کرائے۔ اس کا ایک ایک شہری ان صفات کو اپنے میں پیدا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ رحمٰن ہے، رحیم ہے، رازق ہے، قہار ہے، جبار ہے، وارث ہے۔ ریاست مدینہ کے ہر فرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان صفاتِ الٰہی کو اپنے میں پیدا کرے اور پھر ان پر عمل کرے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ ہر صفت کو اس جگہ استعمال کرے جہاں وہ استعمال کرنی ضروری ہو۔ عدل کے مقام پر عدل اور رحم کے مقام پر رحم۔ جہاں غلبہ دکھانا مقصود ہو وہاں عزیز کی صفت کو استعمال کرے، جہاں حکمت دکھانی مقصود ہو وہاں حکیم کی صفت کو استعمال کرے۔ قرآنِ کریم میں جو صفات آئی ہیں ان کے ربط اور تعلق اس کی سابقہ آیت سے ہوتا ہے۔ یہ صفاتِ باری تعالیٰ استعمال نہیں ہوئیں بلکہ ان میں سابقہ آیت کے مفہوم کو ہی سمیٹ دیا ہوتا ہے۔ ان کو اپنے میں develop کرنے سے انسان کی تمام خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوجاتی ہیں اور اس کا تزکیۂ نفس ہوجاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں حضور ﷺ کے متعلق وَيُزَكِّيهِمْ (3:164) اور آپ ﷺ لوگوں کا تزکیہ کرتے ہیں یعنی وہ انسانوں کی خوابیدہ صلاحیتیوں کو مکمل کردیتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ نہیں تھا کہ حضور ﷺ کسی کے سر پر ہاتھ پھیر کر، یا اس کو دعاؤں کے ذریعہ تزکیہ کردیتے تھے، اس کی صلاحیتیوں کو بیدار کرتے تھے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ حضور ﷺ ریاستِ مدینہ میں صفاتِ الٰہی کو اس طرح جاری کرتے تھے کہ ان صفات کا پرتو ہر جگہ چمکتا نظر آتا تھا وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا (39:69) اور ہر شخص میں وہ صفات از خود بیدار ہوجاتی تھیں اور ریاستِ مدینہ کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ اس کے ہر شہری کی صلاحیتیں پوری طرح مکمل ہوں۔ اگر ریاستِ مدینہ میں ایک شہری کی بھی صلاحیت مکمل نہیں ہوتی تو وہ ریاستِ مدینہ نہیں کیونکہ یہ اللہ کا وعدہ پورا نہیں کیا۔

(5) ریاستِ مدینہ چونکہ اللہ تعالیٰ کے Behalf پر قائم ہوتی ہے اس لئے اس میں تمام عمالِ حکومت حاملین عرش الٰہی ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو جوابدہ ہوتے ہیں۔ سیکولر ریاستوں میں قوت کا سرچشمہ عوام ہوتے ہیں۔ ریاستِ مدینہ میں قوت کا سرچشمہ قانونِ الٰہی قرآن ہوتا ہے۔ سیکولر حکومت میں حکومت کی نافرمانی کرنے والا مجرم ہوتا ہے۔ اس کی اللہ تعالیٰ کے ہاں گرفت نہیں کیونکہ اللہ تو اس حکم کو سند ہی نہیں کرتا۔ ریاست مدینہ میں نافرمانی کرنے والا مجرم بھی ہوتا ہے اور گنہگار بھی ہوتا ہے۔ ریاستِ مدینہ میں Crime اور Sin دونوں ایک ہوجاتے ہیں۔ سیکولر حکومت میں اگر کوئی شخص ٹریفک سگنل کی نافرمانی کرتا ہے تو وہ صرف مجرم ہوتا ہے۔ ریاست کو جوابدہ ہے لیکن ریاستِ مدینہ میں وہ مجرم بھی ہوتا ہے اور گنہگار بھی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاستِ مدینہ میں جرائم نہیں ہوتے کیونکہ وہ گنہگار بھی ہوتے ہیں۔ سیکولر حکومت میں آپ Crime نہیں روک سکتے کیونکہ وہ مجرم اللہ کے ہاں جوابدہ نہیں ہے پھر اسے جرم کرنے سے کوئی چیز نہیں روک سکتی۔

(6) سورۃ النساء میں ارشادِ عالی ہے: إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا (4:58) تم جو اشیاء ایک دوسرے کے پاس رکھتے ہو یہ بھی ٹھیک ہے لیکن یہ اس آیت کا پورا مفہوم نہیں ہے کیونکہ آیت کا اگلا حصہ کہہ رہا ہے کہ جب

فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔ آیت کا یہ حصہ پکار پکار کر مفسرین کے نظریہ کی تردید کر رہا ہے اور ظاہر کر رہا ہے کہ یہاں وہ اختیارات مراد ہیں جو عدل وانصاف کرنے سے متعلق ہوں ان امانات سے مراد وہ فرائض وذمہ داریاں ہیں جو کسی کے سپرد کی جائیں۔ ریاستِ مدینہ میں سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ ریاست کے استحکام کے لئے ذمہ داریاں ان لوگوں کے سپرد کی جائیں جو ان کو نبھانے کی اہلیت وصلاحیت رکھتے ہوں۔ ریاستِ مدینہ میں ارباب حل وعقد کے سپرد اختیارات نہیں کئے جاتے بلکہ ان کے سپرد امانات یعنی ذمہ داریاں وفرائض کئے جاتے ہیں۔ ایمان کا مادہ امن ہے۔ اس لئے یہاں امانات سے مراد وہ فرائض ہیں کہ جن سے ارباب حل وعقد ریاست میں ایسا سکون کر دیں کہ شہری سکون سے رہیں۔ کوٹہ سسٹم قرآن کی رو سے درست نہیں ہے کیونکہ اس میں اہلیت نہیں دیکھتے یہ دیکھتے ہیں کہ ہر صوبے کے افسران صوبہ کی آبادی کے تناسب سے ملازمت میں آجائیں، اس آیت کے حکم کے مطابق ہر شخص کو سوچ سمجھ کے ووٹ اُس کو دینا چاہئے جو اُس کا اہل ہو کیونکہ ووٹ دینا بھی امانت یعنی ذمہ داری سپرد کرنا ہے کہ جس کو ووٹ دیا جائے وہ ووٹر کے لئے ریاست میں ووٹر کی ضروریات کی ذمہ داری پوری کرے ورنہ وہ اللہ تعالیٰ کے آگے جوابدہ ہوگا۔

(7) ارشادِ عالی ہے: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ (9:111)

ترجمہ: جماعتِ مومنین سے ایک معاہدہ ہوتا ہے۔ اس معاہدہ کی رُو سے نظامِ خداوندی ان کے جان ومال خرید لیتا ہے اور اس کے معاوضہ میں انہیں جنتِ ارضی مہیا کرتا ہے۔ اس معاہدہ میں فریق اس دنیا میں ہوتے ہیں۔ اسلامی مملکت مومنین کی جان ومال خرید لیتی ہے۔ فروخت ہونے والی جنس مومنین کی جان ومال اس دنیا میں ہوتے ہیں بہ قیمتِ فروخت مومنین کے جان ومال خریدنے والی شے جنت۔ اس دنیا میں اسلامی حکومت خریدتی ہے لیکن ہمارے مفسرین کہتے ہیں کہ جنت آخرت میں ملے گی۔ یہ معاہدہ درست نہیں ہے۔ ہمارے مفسرین کے نزدیک یہ معاہدہ صرف ذہنی، فکری اور ایمانی معاملہ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کوئی ذہنی وفکری معاہدہ نہیں ہے کہ آپ نے ذہن میں سوچ لیا کہ میں نے اپنا مال وجان خدا کے ہاتھوں فروخت کر دیا اور خدا مجھے مرنے کے بعد جنت میں جگہ دے گا۔ یہ معاہدہ محسوس شکل میں نظامِ خداوندی سے کیا جاتا ہے جسے سب سے پہلے حضور ﷺ نے قائم فرمایا تھا اور جسے حضور ﷺ کے جانشینوں نے قائم رکھا۔ ریاستِ مدینہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ مومنین کو ایسی امن وامان کی ریاست فراہم کرے جو جنت کی طرح پُرسکون ہو۔ اسے جنتِ ارضی کہتے ہیں۔

یہ وہ چند ذمہ داریاں ہیں جو ریاستِ مدینہ پوری کرتی ہے اگر ریاستِ مدینہ یہ ذمہ داریاں پوری نہیں کرتی تو اس کی اطاعت مرفوع ہوجاتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر ریاستِ مدینہ کسی ایک شخص کو بھی رزق فراہم نہیں کرتی اور کوئی شخص رات کو بھوکا سوجائے تو اس ایک آدمی کے بھوکے سوجانے سے ساری ریاست کی آبادی سے اس ریاست کی اطاعت مرفوع ہوجاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے یہ بہت انقلاب انگیز قدم اٹھایا ہے کہ اس نے رزق کی ذمہ داری انفرادی کی بجائے اجتماعی ذمہ داری بنادی ہے اگر کوئی مزدور دن میں کچھ بھی نہیں کما سکا اور شام کو اپنے گھر خالی ہاتھ لوٹا اور رات کو اپنے بچوں کو کھانا مہیا نہیں کر سکا تو اس میں وہ مزدور قصوروار نہیں ہے بلکہ اس میں ریاستِ مدینہ ذمہ دار ہے کہ وہ اس مزدور کو کھانے کا کوئی سامان مہیا نہ کر سکی۔

The Human Self and Allah

Episode No. 4

By G. A. Parwez
(Translated by: Dr. Ejaz Rasool)

(1) Their development can only take place provided that man keeps the Divine attributes as a standard in front of him. This is the fundamental relationship between a human being and Allah. That which is termed as obedience of the Divine laws is not the obedience of the orders of (Allah forbid) a tyrant or absolute dictator, but instead is obedience of the guidance through which development of the human self takes place. By obeying these instructions, the demands of this human self are satisfied.

It is also clear from this that when we mention the Divine attributes (*Asma-al-Husna*), then it is also in fact a reference to the attributes (finite and in a constrained form) of our own self. This is why it is stated in the Quran:

> We have revealed for you (O men!) a Book in which is a message for you…(21:10)

Surely, We have sent a Book in your direction in which is your *Zikr*. (The meanings of *Zikr* are eminence and importance and also to mention).

In the words of Iqbal:[1]

> Muhammad is Yours, so is Gabriel, and the Quran too,
> But this sweet Word, is it Your representation or mine?

(2) As the human self keeps developing, he continues to become a participant in the creative programme of Allah. In this way the

[1] Sir Dr. Muhammad Iqbal – Poet of the East.

which Allah is, how ever, the Companion with the higher status.

This relationship between Allah and man will not be found anywhere else other than in the Quran. Among the followers of religion in the east the relationship of man with God is only this much that man worships God because this is the command of God, which man has to obey whether willingly or unwillingly. If an individual does not obey His command, then God becomes angry. In order to appease Him it is necessary to make offerings to Him, or to gain intercession through someone 'closer' to Him. When He becomes pleased in this way, the wishes of man are met, and if He remains angry, then man becomes stuck in misfortune.

Contrary to this, according to the philosophers and thinkers of the West, the relevance of God is only related to the outer universe in which His laws (in the form of natural laws) are operating. It is the task of man to study these laws, and by employing them, harness the forces of nature and bring them into his use. As for the human world, in this men will need to resolve their matters through the use of their own intellect and wisdom; for these there are no immutable principles and laws.

Another concept of the relationship with God is that of those people who have faith in 'spiritualism'. They claim that they have a direct contact with God. They talk to God, hold meetings with Him, get the supplications of people accepted from Him, He discloses hidden matters to them etc., etc. The concept of these kinds of connections is also against Quranic teaching. Whatever Allah wished to impart to mankind is conveyed in a complete form for the last time in His Book (the Quran). The only means of contact now with Allah for human beings is by following His Book.

From this, this reality will have become evident to you, why the Quran has proclaimed to the 'God worshippers' of the world:

So if they have Eimaan as you have Eimaan, they are indeed on the

right path…(2:137)

If these people accept *Eimaan*in the way that you (*Jamaat eMomineen*) have accepted it, only then can you acknowledge that they have found the correct path of life. If they do not accept *Eimaan* like this and continue to believe in God according to their own concepts, then in the register of Allah they will not be counted among those who have '*Eimaan* in Allah' i.e. according to the Quran this will not be called *Eimaan* in Allah. Furthermore, this much should also be fully understood, that the practical concept of having '*Eimaan* in Allah' means to obey His commands and laws. The Quran does not count that individual who accepts Allah in words yet obeys the commands of non-Allah (other than Allah),as being among the followers of Allah:

…if any do fail to judge by (the light of) what Allah has revealed, they are (no better than) Unbelievers. (5:44)

Those people who do not make decisions according to the Book of Allah are the ones who are called *Kafir*.❶

1.17 *Asma-al-Husna* (Balanced Attributes)

Not only has the Quran mentioned the Divine attributes in general terms but by declaring these as *Al-Asma-al-Husna*, has draw nattention towards another fact. *Husna* is derived from *Husn*, and this is the name of precise proportion. If the proportion of a thing is even slightly disturbed, its *Husn* no longer remains. This is why historians have said that 'if Cleopatra had a slightly flatter nose, the map of history would have been something else'. The meaning of *Asma-al-Husna*is that, whereas these attributes of Allah are most supreme and most complete, infinite

❶ *Kafir* - this term is used for those who do not accept the Quran as a revelation from Allah The word is normally translated as non-believer. Its root *Kufr* (K-F-R) has many facets which include to knowingly deny truth, to prevent, to defy Divine laws. Basically, it means to cover or conceal. It means open denial, not hypocrisy (which is concealed). It also means withholding the means of subsistence which Allah has created for the benefit of the whole of humanity. (Ed)

proportion is also found in them. The fact is that correct (and constructive) results can only be derived from attributes and traits when there is precise proportion and balance present in these attributes and traits. No prescription can be effective until there is precise proportion in the weight of its constituent medicinal ingredients. Taking this concept further, this reality will become evident that, for example, water is life-giving but only in that situation when there is a correct proportion of it in the human body. If there is even the slightest decrease or increase in its proportion, then human health is adversely affected; not only does health deteriorate, but if its proportion exceeds a limit (as happens in the case of drowning) then this can result in immediate death. Another example is of arsenic, which is a killer chemical, but if it is given in a correct dose it promotes life and sustains strength.

Moving away from the physical world, let us enter the domain of ethics in which this same reality can be seen to be working. For example, being gentle is a pleasant trait but if it exceeds a certain limit, then this becomes disgrace. Forgiveness and overlooking something are good traits within limits, but if these limits are exceeded then it becomes cowardice. Spending wealth is necessary for life, but if it deviates towards excess it becomes wastefulness, and if it is held back then it becomes miserliness. Therefore, attributes and traits only produce pleasant effects when their proportion is correct. In other words, in order to establish correct results it is absolutely essential that there is balance in the attributes.

1.18 Apparently Contradictory Attributes

In the same way that there are Divine attributes in the Divine Self, similarly when there is development in the human self, there is a need for its attributes also to have balance. You will see that the whole teaching of the Quran revolves around this central point. It is stated clearly in it which attribute should manifest itself on what occasion, and to what extent this manifestation should be. Allah gives both life and death (23:80). He is also the giver of severe punishment (2:165) and the One

with mercy (2:160). To the superficial gaze there appears to be a contradiction in these attributes, but for the visionary who descends from the surface and reaches down into the depths of reality, he can say with full surety and certainty based on evidence that there is no contradiction in understanding and stating it as such -that water can both promote life as well as end life. This was the superficiality of vision as a result of which Christianity stated that God is Mercy and that salvation is only through His Grace, not through deeds. And on the other hand, Hinduism created the philosophy of '*Karm-yog*', according to which there is no escape whatsoever from the punishment resulting from a wrong deed (big or small). (The doctrine of reincarnation is based on this assumption). In opposition to both these beliefs, the Quran informs us for example, that:

(1) Arsenic, if used in appropriate measure, is useful.
(2) If it exceeds this proportion slightly, then its harmful effects will ensue.
(3) And if it greatly exceeds a certain limit then it becomes fatal.

Point (3) is that condition where the Law of Requital will be declared as being a severe punishment (*Azaab*) i.e. holder of fatal consequences. But under point (2) it is obvious that by taking suitable actions the dangerous effects of arsenic can be removed. This is called *Tawwabiyyat* (returning). This reality is expressed by the Quran in these words:

…For those things that are good, remove those that are evil…(11:114)

This is called *Afw* in Quranic terms. The proper place for these matters will come later, where explanations will be provided of Allah's various attributes in detail. We thought it necessary to illustrate it briefly at this stage so that this reality becomes clear:

a. What the true meaning of the apparently opposing attributes of the Self of Allah is.

b. What the significance of the attributes being proportionate and balanced is.
c. When these attributes become reflected in the self of an individual with correct proportion and balance, he will be declared as the holder of a balanced personality; and the degree to which a balanced personality epitomises true contentment and real peace and happiness, there is no need to say anything further about that.
d. And it is obvious how balanced that society itself will be which consists of such individuals whose personalities are balanced;and the level of peace and tranquility in which humanity will live because of the establishment of such a society, there is no need to elaborate further on that either.

In relation tothe Divine attributes, these matters will also not be available anywhere other than in the Quran. This fact will also become apparent from these details later, with what beauty and finesse the ethical values become defined, and with what ease the clash between good and evil becomes resolved which has perturbed and muddled the intellectual world from the beginning till today. (Further discussion regarding this point will come a littlelater on).

1.19 The Infinite Attributes of Allah

At this stage this much further clarification is necessary that some of Allah's attributes are such that their precise definition (like the form and reality of the Divine Self) is beyond the cognitive limits of our intellect. For example, it is stated in the Quran that 'He is the First and the Last' (57:3). We have already previously stated that the concept of such a time which has no beginning any where can never even enter our mind, nor can we even conceive of the concept of a space which has no limits.

When we state about Allah that He is the First, we simply cannot truly and correctly compreh end His infinitude. Our mind will of a certainty make its beginning from some point or other. Similarly, when we state about Him that He is the Last, then our mind cannot conceive of this either - it will definitely come to a standstill at some point or other.

To Be Continued

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآن کریم کے احکام وقوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر امت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاج رسالت کہا جاتا ہے۔

8- بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے امت میں انتشار پیدا ہو گیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امورِ دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن بعد میں مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہو گئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

9- ہمارے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو امت کو احکام وقوانین خداوندی کے مطابق چلائے۔ اس نظام کی بلند ترین اتھارٹی کو مرکز ملت کہا جائے گا اور اس کی طرف سے جاری شدہ احکام کی اطاعت خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کے قائم مقام قرار پائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانین خداوندی کے تابع ہوگی۔

10- چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہوگا' اس لئے اس میں موجودہ ثنویت ختم ہو جائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہوگا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کے لئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہم دگر مدغم ہو جائیں گے۔

11- جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہو جاتا' امت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز' روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کر رہے ہیں' کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی ردوبدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کر کے اسے "خدا اور رسول ﷺ" کا طریقہ قرار دے۔ یہ حق قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کو پہنچتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ امت کے اختلافات کو مٹا کر اس میں وحدت پیدا کرے۔

12- قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی' روٹی' کپڑا' مکان' علاج' تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

13- قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہو سکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کر سکتا ہے۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو' یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

14- جہاں تک احادیث کا تعلق ہے' ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو' یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

15- ہم' رسول اللہ ﷺ کے بعد' ہر قسم کے مدعی وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

16- طلوع اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے (اسے فرقہ اہل قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں)' نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ امت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز' روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں' ہم ان میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کرتے۔ ہم صرف قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کا قیام عمل میں آسکے۔ یہ ہے ہمارا مقصد' جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آ رہے ہیں۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.75
ISSUE
3

Monthly **TOLU-E-ISLAM**
25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org
www.facebook.com/talueislam/ www.youtube.com/idaratolueislam

قومیں ایک دن میں نہیں بنا کرتیں

”آپ اچانک ایک نئی دنیا تخلیق نہیں کر سکتے۔
حصولِ آزادی کے لئے آپ کو ایک عمل سے گزرنا
ہوگا۔ آپ کو آگ کے دریا، ابتلاء اور قربانیوں کی
راہ سے گزرنا پڑے گا۔ مایوس نہ ہوں۔ قومیں ایک
دن میں نہیں بنا کرتیں لیکن جیسا کہ ہم رواں دواں
ہیں ہمیں ایسے قدم اٹھانے چاہئیں جو ہمیں آگے کی
طرف لے جائیں۔ آپ حقائق کا مطالعہ کریں ان
کا تجزیہ کریں اور پھر اپنے فیصلوں کی تعمیر کریں۔“

(کلکتہ یونیورسٹی، پوسٹ گریجوایٹ طلباء سے
قائداعظم کا خطاب، کلکتہ 21 اگست 1936ء)